یکم و ۱۶ اگست ۲۰۲۴ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۷۔ شمارہ نمبر: ۱۵۔۱۶

پندرہ روزہ

معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

اسرائیل کو انتہائی مطلوب

حماس کے نئے سربراہ یحییٰ سنوار کون ہیں؟

ظفر سید

فلسطینی تنظیم حماس نے گزشتہ دنوں اعلان کیا ہے کہ ان کے سیاسی دفتر کے نئے سربراہ یحییٰ سنوار ہوں گے۔ اس سے قبل اس عہدے پر اسماعیل ہنیہ فائز تھے، مگر انہیں گزشتہ ہفتے تہران میں ایک مبینہ اسرائیلی حملے میں شہید کر دیا گیا تھا۔

۶۱ سالہ یحییٰ سنوار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ۷/اکتوبر کو حماس کی جانب سے اسرائیل پر حملے کے چند منصوبہ سازوں میں سے ایک تھے۔ اس کے بعد سے غزہ پر حملے کے دوران اسرائیل انہیں تلاش کرنے کی ناکام کوششیں کرتا رہا ہے۔

میڈیا رپورٹ کے مطابق غزہ پر حملہ آور اسرائیلی فوج ڈرونز، حساس جاسوسی آلات اور انسانی انٹیلی جنس کی مدد سے سنوار کو تلاش کر رہی ہے لیکن ابھی تک ان کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔ ممکنہ طور پر وہ غزہ کی زیرِ زمین سرنگوں میں کہیں روپوش ہیں۔

ایسوسی ایٹڈ پریس کے مطابق حماس کی فوجی طاقت بڑھانے کے لیے برسوں تک کام کرنے والے یحییٰ سنوار کا انتخاب اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ حماس غزہ میں اسرائیل کی جنگ سے ہونے والی ۱۰/ماہ کی تباہی اور سنوار کے پیش رو اسماعیل ہنیہ کے قتل کے بعد بھی لڑائی جاری رکھنے کے لیے تیار ہے۔ اس سے اسرائیل کے بھی مشتعل ہونے کا امکان ہے، جس نے اسے سات اکتوبر کے حملے کے بعد سنوار کو اپنی ہٹ لسٹ میں سب سے اوپر رکھا ہے۔

سنوار کی نامزدگی کا اعلان ایسے وقت میں ہوا ہے کہ خطے میں صورتحال غیر مستحکم ہے۔

ایران نے ہنیہ کے قتل پر اسرائیل سے بدلہ لینے کا عہد کیا ہے اور لبنان کی حزب اللہ نے گزشتہ ہفتے بیروت میں ایک فضائی حملے میں اسرائیل کی جانب سے اپنے ایک اعلیٰ کمانڈر کی ہلاکت پر جوابی کارروائی کی دھمکی دی ہے۔

اسرائیل نے سنوار کو 'ختم' کرنے کا عہد کر رکھا ہے جبکہ وزیرِ اعظم نیتن یاہو نے ان کا موازنہ ہٹلر سے کیا تھا۔

غزہ پر اسرائیلی حملے کے دوران میں اسرائیل اور حماس کے درمیان قیدیوں کے تبادلے کے سلسلے میں یحییٰ سنوار کا نام سب سے زیادہ منظرِ عام پر آیا تھا اور کہا گیا تھا کہ یہ تبادلہ انہی کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔

اگرچہ حماس اور اسرائیل کے درمیان مذاکرات مصر اور قطر میں ہوئے ہیں لیکن نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق سنوار کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ مذاکرات کاروں کو ان کی منظوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ حماس کے رکن اور سیاسی تجزیہ کار صلاح الدین العواودہ نے نیویارک ٹائمز کو بتایا کہ سنوار سے مشورہ کیے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

العواودہ ۱۹۹۰ء اور ۲۰۰۰ء کی دہائیوں میں اسرائیل میں قید کے دوران سنوار کے دوست بن گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ سنوار 'کسی قسم کے منیجر یا ڈائریکٹر نہیں ہیں، وہ ایک رہنما ہیں'۔

اسرائیل کو سب سے زیادہ مطلوب شخص

اسرائیلی ڈیفنس فورس کے ترجمان ریئر ایڈمرل دانیال ہاغاری نے سات اکتوبر کے حملے کے بعد کہا تھا، 'اس حملے کا فیصلہ یحییٰ سنوار نے کیا تھا۔ اس لیے وہ اور ان کے ساتھی مردہ ہیں' یعنی اسرائیل انہیں مارنے پر تل گیا ہے۔

سنوار کے ساتھیوں میں محمد الضیف شامل ہیں جو حماس کے ملٹری ونگ عزالدین القسام بریگیڈ کے کمانڈر ہیں۔ گزشتہ ہفتے اسرائیل نے محمد الضیف کے مارے جانے کا دعویٰ کیا تھا مگر حماس نے اس کی تردید کی ہے۔

یورپین کونسل آن فارن ریلیشنز (ای سی ایف آر) کے سینئر پالیسی فیلو ہیولوواٹ نے بی بی سی کو بتایا کہ 'خیال ہے کہ اگرچہ سات اکتوبر کے حملے کی منصوبہ بندی کے پیچھے الضیف کا دماغ تھا کیونکہ یہ ایک فوجی آپریشن تھا، لیکن سنوار 'ممکنہ طور پر اس گروپ کا حصہ تھے جس نے اس کی منصوبہ بندی کی'۔

پچھلے سال دسمبر میں انہوں نے غزہ میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ حماس اسرائیل پر ایک شدید حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔

انہوں نے کہا تھا، 'ہم انشاء اللہ ایک طوفان کی شکل میں تم پر برسیں گے۔ ہم آپ پر لامتناہی راکٹ برسائیں گے، ہم فوجیوں کا لامحدود سیلاب آپ کے پاس لے آئیں گے، ہم

اندرونی صفحات پر

- اسماعیل ہنیہ کی شہادت: صبحِ نو طلوع ہو رہی ہے
- فلسطین کا بڑا قیدی
- غزہ جنگ بندی معاہدہ، تخت بھی اور تختہ بھی!
- ترک خلافت پر یہودی حملہ
- حسینہ واجد کے پہلے ۲۴ گھنٹے کیسے گزرے؟
- بنگلادیش میں طلبہ تحریک
- جب تاج اچھالے جاتے ہیں
- کلاس روم میں مصنوعی ذہانت

اپنے لاکھوں لوگوں کے ساتھ آپ کے پاس آئیں گے'۔

اسرائیل میں سنوار کے خلاف نفرت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اسرائیلی گلوگارہ رینات بار نے اسرائیل ڈیفنس فورس کے فوجیوں کے سامنے پرفارم کرتے ہوئے عربی گیت 'یا بنت السلطان' کے بول بدل کر گائے جس میں انہوں نے کہا، 'یا یحییٰ سنوار، آپ کل مر جائیں'۔

سات اکتوبر کے حملوں کے بعد سنوار کا ایک بیان منظر عام پر آیا تھا جس میں انہوں نے خبردار کیا تھا، 'قابض رہنماؤں کو جان لینا چاہیے کہ سات اکتوبر صرف ریہرسل تھی'۔

'ہیلو، میں یحییٰ سنوار ہوں، تم یہاں محفوظ ہو'

خبر رساں ادارے رائٹرز کے مطابق حماس کی جانب سے سات اکتوبر کو قید کی جانے والی اور دو ہفتے بعد رہا ہونے والی ایک ۸۵ سالہ اسرائیلی خاتون نے ۲۹ نومبر کو کہا کہ وہ قید کے دوران غزہ کے رہنما یحییٰ سنوار سے ملی تھیں اور ان سے پوچھا تھا کہ انہوں نے میرے جیسے پُرامن کارکنوں پر حملہ کیوں کیا۔ ۸۵ سالہ یوشیود لیفشیٹز کو اسرائیل میں ان کے گاؤں نیر اوز سے سات اکتوبر کو حماس کے عسکریت پسندوں نے پکڑ کر غزہ میں قید کر لیا تھا۔

انہوں نے اسرائیلی اخبار داوار کو بتایا کہ ان کا سامنا سنوار سے اس وقت ہوا جب وہ یرغمالیوں سے ایک زیر زمین سرنگ میں ملے جہاں حماس نے انہیں یرغمال بنا رکھا تھا۔

''یروشلم پوسٹ'' کے مطابق رہا ہونے والی ایک خاتون قیدی نے بتایا کہ سنوار اس سرنگ میں آ پہنچے جہاں انہیں اور دوسرے قیدیوں کو رکھا گیا تھا اور ان سے حال احوال پوچھا، رواں عبرانی میں بتایا کہ انہیں نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

ایکس کی صارف Haya نے ایک پوسٹ میں لکھا، 'رہا ہونے والے اسرائیلی جنگی قیدیوں میں سے ایک نے بتایا کہ یحییٰ سنوار داخل ہوئے اور عبرانی زبان میں ان سے اپنا تعارف کرایا، 'ہیلو، میں یحییٰ سنوار ہوں اور تم یہاں محفوظ ہو، تمہیں کچھ نہیں ہوگا'۔ اسرائیل کے چینل ۱۲ کے مطابق اسرائیلی سکیورٹی اداروں نے بھی اسرائیلی قیدی کے اس بیان کی تصدیق کی تھی۔

اسرائیلی جیلوں میں ۲۲ برس

۶۱ سالہ یحییٰ سنوار کو ابو ابراہیم بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اسرائیلی جیلوں میں ۲۲ برس گزارے ہیں۔ وہ ۲۰۱۱ء تک اسرائیل کی ایک جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہے تھے کہ حماس کی قید میں موجود اسرائیلی فوجی گیلاد شالت کے بدلے میں دوسرے فلسطینی قیدیوں کے ساتھ انہیں بھی رہائی مل گئی۔

گیلاد شالت کو حماس نے ۲۰۰۶ء میں غزہ کی حدود میں گھات لگا کر قید کر لیا تھا جس کے عوض اسرائیل نے ۱۰۲۷ قیدیوں کو رہا کیا، جن میں سیکڑوں ایسے فلسطینی بھی شامل تھے، جنہیں اسرائیلی فوجیوں اور شہریوں کے خلاف حملوں کے جرم میں سزا سنائی گئی تھی۔ رہائی کے چھ برس بعد سنوار کو فروری ۲۰۱۷ء میں ایک خفیہ انتخابی عمل کے بعد اسماعیل ہنیہ کی جگہ حماس کے عسکری دھڑے کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ ہنیہ بعد میں حماس کے سربراہ بن گئے تھے۔

'قیدی نمبر ۱'

اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسی شین بیت کے ایک اہلکار یارون بلم نے یحییٰ سنوار کے انتخاب کے بعد اسرائیل ریڈیو کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ یحییٰ 'کو 'قیدی نمبر ۱ کی حیثیت حاصل تھی'۔

بلم نے یہ بھی کہا تھا کہ 'سنوار سحر انگیز شخصیت کے مالک ہیں اور بدعنوان نہیں ہیں'۔ انہوں نے کہا تھا کہ سنوار عمل پر یقین رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت بہت مشکل ہوگی۔

واشنگٹن انسٹی ٹیوٹ فار نیئر ایسٹ پالیسی کے ایہود یاری کے مطابق سنوار جیل میں خود کو بطور رہنما منوانے میں کامیاب ہوگئے اور ان کی خاطر جیل حکام سے مذاکرات کرنے اور قیدیوں میں نظم وضبط قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔

برطانوی اخبار گارڈین کی ایک رپورٹ کے مطابق جیل میں سنوار سے پوچھ گچھ کرنے والے ایک سابق اسرائیلی تفتیش کار نے کہا کہ جیل میں قید کے دوران 'سنوار نے کسی بھی اسرائیلی سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ دوسرے قیدیوں کو خود سزا دیا کرتے تھے جو اسرائیلیوں سے بات کرتے تھے'۔ تفتیش کار کا کہنا تھا کہ 'وہ ۱۰۰۰ فیصد پُرعزم اور ۱۰۰۰ فیصد پُرتشدد شخص ہیں'۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ گارڈین نے لکھا کہ سنوار 'ایک تیز دماغ کے ساتھ ایک ذہین سیاسی کارکن بھی ہیں'۔

گارڈین کے مطابق جس طریقے سے سنوار رہا ہوئے اس سے انہوں نے اپنے تجربے سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اسرائیلی جیلوں میں قید فلسطینیوں کو رہا کرنے کا واحد راستہ اسرائیلی فوجیوں کی گرفتاری ہے۔

اس وقت سنوار سے ملاقات کرنے والے ایک صحافی نے گارڈین کو بتایا کہ 'سنوار کی توجہ اس قدر مرکوز تھی کہ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے لیے بقیہ دنیا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی'۔

عبرانی زبان میں مہارت

ایہود یاری کہتے ہیں کہ سنوار عبرانی اخبار پڑھا کرتے تھے اور ان سے ہمیشہ عبرانی میں بات کرتے تھے۔

عبرانی زبان میں ان کی مہارت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ۲۰۱۱ء میں رہا ہونے سے چند ماہ قبل انہوں نے عبرانی زبان میں انٹرویو دیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلی حکام کی نظروں میں وہ 'اعتدال پسند' ہو گئے تھے۔

فنانشل ٹائمز نے اسرائیلی انٹیلی جنس تنظیم شین بیت کی طرف سے سنوار سے پوچھ گچھ کرنے والے ایک اہلکار کے حوالے سے بتایا کہ سنوار جیل میں 'ولادی میر جابوٹنسکی، مینا خم بیگن اور اسحٰق رابن جیسی اسرائیلی شخصیات کے بارے میں کتابیں پڑھتے رہتے تھے'۔ عبرانی پر عبور اور اسرائیلی جیلوں میں طویل عرصہ گزارنے کی وجہ سے سنوار خود کو اسرائیلی سیاست اور ثقافت کے ماہر سمجھتے ہیں۔

چھتوں سے رِستے پانی کی ٹپ ٹپ

سنوار کے خاندان کا تعلق فلسطینی گاؤں المجدل عسقلان سے ہے، جہاں سے اسرائیل نے ۱۹۴۸ء میں فلسطینیوں کو بے دخل کر دیا تھا۔ اب یہ علاقہ اسرائیلی شہر عسقلان کا حصہ ہے۔ سنوار سات اکتوبر ۱۹۶۲ء کو خان یونس میں پیدا ہوئے تھے۔ ابھی ان کی عمر پانچ برس تھی کہ اسرائیل نے اس شہر پر قبضہ کر لیا۔

وہ اپنی کتاب 'کانٹے اور پھول' (الشوک والقرنفل) میں لکھتے ہیں کہ '۱۹۶۷ء کی سردیاں بہت بھاری گزریں، بہار آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی کہ اچانک بارش شروع ہوگئی اور غزہ شہر کے مہاجر کیمپ کے کچے گھر پانی میں ڈوب گئے۔۔۔ سیلابی پانی ہمارے گھر میں داخل ہو گیا'۔

وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت وہ گھر میں اپنے بڑے تین بھائیوں اور ایک بہن کے ساتھ موجود تھے جو سیلاب سے خوفزدہ ہو گئے۔ 'میرے والد اور والدہ نے فرش گیلا ہونے سے پہلے ہمیں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ میری ماں نے گھر میں پانی داخل ہونے سے پہلے بستر اٹھا لیا۔ میں سب سے چھوٹا تھا اس لیے میں اپنی ماں کے ساتھ چمٹ گیا۔ 'رات کو میری ماں چھت کے نیچے ایلومینیم کے برتن رکھتی تھی تاکہ چھت سے ٹپکتی بوندیں ان میں گریں۔ 'میں جب بھی سونے کی کوشش کرتا، تو پانی کی ٹپ ٹپ مجھے سنائی دیتی۔ جب برتن بھر جاتے تو میری ماں انہیں خالی کر دیتی'۔

نوجوانی ہی میں سنوار نے غزہ میں اخوان المسلمون کی تحریک میں شمولیت اختیار کی، جس کا نام ۱۹۸۷ء کے آخر میں بدل کر حماس تحریک میں تبدیل ہو گیا۔

سنوار نے غزہ کی اسلامی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور عربی زبان میں بیچلر کی ڈگری حاصل کی۔

////// باقی صفحہ نمبر ۵ \\\\\\

اسماعیل ہنیہ کی شہادت: صبحِ نو طلوع ہو رہی ہے

Dr Amira Abo el-Fetouh

یہ مضمون اسماعیل ہنیہ کی شہادت کے غم میں تحریر نہیں کیا گیا۔ ویسے بھی شہید کی موت پر غم نہیں منایا جاتا۔ یہ قابلِ قدر ہستیاں ہماری جیسی نہیں ہوتیں۔ شہداء کو حیاتِ جاوداں حاصل ہوجاتی ہے۔ ان کے اجر کا اندازہ کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ ان سے رب کریم سوالات بھی نہیں کریں گے۔ ہنیہ جیسی شخصیت حادثات یا بیماری سے نہیں مرا کرتیں۔ ہنیہ کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ان شہداء کے ساتھ امر کردیا جنہوں نے اپنی زندگی وطن عزیز کی آزادی اور انصاف کے لیے قربان کردی۔ شہید کا تاریخی جنازہ اس عزم کا اظہار ہے کہ ہماری جدوجہد اپنی منزل کی جانب بڑھ رہی ہے۔

لہٰذا ہم ہنیہ کی شہادت پر غم کا اظہار نہیں کرتے بلکہ انہی الفاظ کو دہراتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ احد کے موقع پر فرمائے تھے، جب کہ مشرکین اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے۔ ’’ہمارے شہداء تو جنتوں میں ہیں جبکہ تم لوگ جہنم کا ایندھن بننے والے ہو‘‘۔

وہ افراد جو ہنیہ کی شہادت پر مسرور ہیں، ان کا خیال ہے کہ انہوں نے ایک بڑی کامیابی حاصل کرلی ہے۔ انہیں ان الفاظ کو یاد رکھنا چاہیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دس ماہ سے تمام تر وسائل کے باوجود وہ مجاہدین کو شکست نہیں دے سکے۔ جبکہ انہوں نے اب سیاسی شخصیات کو قتل کرنے کا آغاز کردیا ہے۔ صاف ظاہر ہے، وہ میدانِ جنگ میں شکست سے دوچار ہوچکے ہیں۔ وہ جنگ ہار چکے ہیں۔

غاصب ریاست نے بظاہر ہنیہ کو شہید کردیا ہے لیکن ہرگز وہ حماس کے نظریات کو مٹا نہیں سکتے۔ حماس اپنی جدوجہد کو جاری رکھے گی اور صہیونی ریاست کے لیے مزاحمت کا استعارہ بن کر اس کے ناپاک عزائم کے خلاف سینہ سپر رہے گی۔ ان کی جدوجہد عالمی قوانین کے مطابق بھی بالکل جائز ہے۔

غاصبانہ قبضہ اپنی تعریف کے مطابق جارحیت اور تشدّد کے زمرے میں آتا ہے۔ عالمی عدالت نے حال ہی میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ فلسطین پر اسرائیلی قبضہ سراسر ناجائز ہے اور غیر قانونی ہے۔

ہنیہ کا قتل دراصل ان شہادتوں کا تسلسل ہے جو صہیونی ریاست حماس کی قیادت کے خلاف جاری رکھے ہوئے ہے۔ ہنیہ کے آخری الفاظ بھی یہی تھے کہ جب قیادت رخصت ہوتی ہے تو کچھ نئے افراد ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ حقیقتاً یہی ہوتا رہا ہے۔ جب غاصب صہیونی ریاست نے شیخ احمد یٰسین، ڈاکٹر عبدالعزیز رنتیسی اور دیگر اہم رہنماؤں کو ۲۰۰۴ء میں شہید کیا تو اس کے بعد یہ تحریک رکی نہیں بلکہ آگے بڑھی۔ غاصب ریاست نے اکتوبر سے اب تک حماس کے کئی اہم افراد کو نشانہ بنایا ہے۔ ان میں مروان عیسیٰ جو حماس کے عسکری ونگ کے نائب کمانڈر تھے۔ القسّام کے ملٹری شوریٰ کے رکن ایمن نوفل، صالح العروری جو حماس کے سیاسی ونگ کے نائب تھے۔ سمیر فندی جنوبی لبنان میں حماس کے ترجمان، عظام القریٰ جو القسّام کے بانیوں میں سے تھے۔ احمد بہار اور جمیلہ الشالطی، یہ دونوں سیاسی ونگ کے ارکان تھے۔ القسّام کے ایمن صیام اور احمد الغندور اور سینئر رہنما اسامہ الموزینی اور فایق المبھو ان تمام کی شہادتوں سے غزہ میں حماس کی کارکردگی اور جدوجہد میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ وہ دس ماہ سے غاصب افواج سے برسرِ پیکار ہیں۔

سیاسی قیادت کا قتل صہیونی ریاست کا نیا حربہ نہیں ہے۔ اسرائیل اصلاً ایک دہشت گرد اور غاصب ریاست ہے۔ ۱۹۴۸ء میں صہیونی دہشت گردوں نے اقوام متحدہ کے مصالحت کار Folke Count کو قتل کردیا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے نازیوں کے زیر حراست ہزاروں افراد کو رہا کروانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ خالد مشعل کو بھی ۱۹۹۷ء میں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

صہیونی ریاست نے ابتدا ہی سے فلسطینی شہریوں کے ساتھ غیر منصفانہ اور تعصب پر مبنی رویہ رکھا ہے جو اس کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔ حکومت اور اس کے اتحادیوں میں دائیں بازو کے متشدد افراد شامل ہیں جو فلسطینیوں کی نسل کشی کو جائز سمجھتے ہیں۔

مغربی جمہوریت اب بھی مجرم اور غاصب ریاست کے قصیدے پڑھ رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عرب کے تاریک اور پسماندہ خطے میں یہی دراصل ایک مثالی ریاست ہے۔ دراصل ان کے مشترکہ مفادات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں لیکن مغرب اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی قیادت کے قتل سے مزاحمتی تحریکوں پر وقتی طور پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ دراصل نفسیاتی جنگ کی ایک شکل ہے جس کے ذریعے وہ مزاحمت کو کمزور کرنا چاہتا ہے۔ تاہم جنگ کے میدان میں وہ اب تک فتح یاب نہیں ہوسکے ہیں۔ غاصب صہیونی ریاست ہنیہ اور حزب اللہ کے فواد شکر کے قتل سے خطے میں جنگ کی آگ اور تنازعات کو مزید تیز کرنا چاہتی ہے۔

ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ اس خطے میں کون امن چاہتا ہے۔ ہرگز صہیونی ریاست امن کی خواہاں نہیں۔ مزاحمت تو بنیادی حق ہے۔ اس حق سے کسی صورت دستبردار نہیں ہوا جاسکتا۔ حماس بطور تحریک اپنے مقاصد کے حصول تک جدوجہد جاری رکھے گی۔ فلسطین کی نئی نسل تو اسی مزاحمت میں پروان چڑھی ہے، یہ کیسے اپنے حق کو چھوڑ سکتی ہے۔ فلسطینی نوجوان جو ۲۰۰۸ء میں پیدا ہوئے، وہ نصف درجن اسرائیلی حملے اور بے شمار عسکری جارحیت سے گزرے ہیں۔ انہیں ہرگز جھکایا نہیں جاسکتا۔

حماس کے بانی شیخ احمد یٰسین نے اسرائیل کے خاتمے کی پیشگوئی کی تھی۔ کیونکہ یہ ناانصافی، ظلم اور فسطائیت پر قائم ہے۔ ایسی ریاست اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔ شیخ احمد یٰسین کے مطابق اسرائیل ۲۰۲۷ء میں ختم ہوسکتا ہے۔ ان سے جب یہ سوال کیا گیا کہ انہوں نے یہ متعین سال کا اندازہ کیسے لگایا تو اس پر انہوں نے قرآن کی یہ دلیل دی کہ قرآن کے مطابق ہر چالیس سال بعد تبدیلی آتی ہے۔ پہلا چالیس سال نکبہ کا تھا، پھر انتفاضہ کے چالیس سال آئے اور اب اس چالیس سال میں اللہ نے چاہا تو اسرائیل کا خاتمہ ہوجائے گا۔ شیخ یٰسین کے مطابق اگلی نسل آزاد فضاؤں میں پروان چڑھے گی۔

صہیونیوں کو اپنی طاقت کا زعم ہے جبکہ ہم اپنی کوتاہیوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ یقیناً اللہ کی مرضی ہر چیز پر غالب ہے۔

شیخ احمد یٰسین اپنے تجزیے میں ٹھیک تھے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ موجودہ نسل اپنی آزادی کے لیے غیر معمولی بہادری اور شجاعت سے لڑ رہی ہے، انہیں موت کا خوف نہیں۔ موت تو آخرت کی منزل کا پہلا زینہ ہے۔ آج کے نوجوان اللہ پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوئے صہیونی ریاست سے برسرِ پیکار ہیں۔ یقیناً یہ صہیونیت کے چنگل سے پوری فلسطینی ریاست کو آزاد کروا کر ہی دم لیں گے۔

(ترجمہ: محمود الحق صدیقی)

"Israel killed Ismail Haniyeh, but will be unable to kill the ideology of Hamas". ("Middle East Monitor". August 5, 2024)

فلسطین کا بڑا قیدی

Nicolas Pelham

اِس موسمِ سرما میں مَیں نے غرب اُردن کے گاؤں کو بر میں چہل قدمی کی۔ وہاں کی عمارتیں زیادہ بلند نہیں۔ چند ایک مقامات پر جھاڑیاں ہیں۔ مجموعی طور پر کُھلی فضا ہے جس کی بدولت ماحول خوشگوار رہتا ہے۔ جب میں نے وہاں کی سیر کی تب پھولوں نے ابھی کِھلنا شروع ہی کیا تھا۔ دور و نزدیک کی پہاڑیوں پر آباد یہودیوں کی بستیاں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اِن بستیوں کے مکانات میں ترتیب اور نفاست دکھائی دیتی ہے۔

یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر جب میں وہاں گیا، اُس سے صرف تین ماہ قبل اِنہی پہاڑیوں سے یہودی آبادکار اتر کر فلسطینیوں پر حملے کرتے تھے۔ فلسطینی دیہاتیوں پر حملے کرنے والے یہودیوں کو پکڑا گیا نہ سزا دی گئی۔ یہاں کے لوگ اُن سے نفرت کرتے ہیں۔ غرب اردن کی دیواروں پر اسرائیل مردہ باد اور دیگر نعرے لکھے ہوئے ہیں۔

جب میں پہنچا تب فلسطینی گاؤں کے لوگوں کا موڈ بہت اچھا تھا۔ فلسطین کے اہم ترین قیدی مروان برغوثی کا بیٹا مجھے لوگوں سے ملوا رہا تھا۔ عرب برغوثی عمر کی تیسری دہائی میں ہے۔ وہ اپنے والد سے خاصا مختلف دکھائی دیتا ہے۔ مروان برغوثی کی شبیہ آپ کو غربِ اردن میں جگہ جگہ دیواروں پر دکھائی دے گی۔ جو فلسطینی ڈرائیورز ہمارے پاس سے گزرے، اُنہوں نے فتح کا نشان بنایا۔ وہ چلا رہے تھے کہ بس ایک ہفتہ اور۔ سب کو یقین تھا کہ مروان برغوثی کو رہا کیا جانے والا ہے۔

مروان برغوثی سیاستدان اور عسکریت پسند لیڈر ہیں جنہیں ایک اسرائیلی عدالت نے دو عشرے قبل پانچ سویلین اسرائیلیوں کے قتل کے احکامات جاری کرنے کا مجرم قرار دیا تھا۔ تب سے اب تک وہ باقی دنیا سے دور ہیں مگر پھر بھی مقبولیت میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہ کسی بھی فلسطینی لیڈر کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہیں۔ مارچ ۲۰۲۴ء میں فلسطینی محقق خلیل شکاکی کے ایک سروے کے مطابق اگر فوری الیکشن ہوں تو مروان برغوثی اپنی دونوں حریف جماعتوں کے مجموعی ووٹوں سے زیادہ ووٹ لینے میں کامیاب ہوں گے۔

گزشتہ برس ۷/اکتوبر کو جب حماس نے ۲۵۰/اسرائیلیوں کو یرغمال بنایا تو امید پیدا ہو چلی تھی کہ اب قیدیوں کے تبادلے میں مروان برغوثی کی رہائی بھی ممکن ہو سکے گی۔

خود اسرائیلیوں کو بھی یقین تھا کہ ایسا کچھ ہوگا۔ جب میں کو برگیا، اُس سے چند ہفتے قبل ہی ایک سینئر اسرائیلی انٹیلی جنس آفیسر مروان برغوثی کے چھوٹے بھائی موکبل کے گھر آیا تھا۔ اُس انٹیلی جنس آفیسر نے فیملی سے پوچھا تھا کہ اُسے کبھی اس مقبول قیدی کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تھا۔ موکبل جانتا تھا کہ اُس اسرائیلی انٹیلی جنس آفیسر کو مروان برغوثی کے بارے میں فیملی سے زیادہ معلوم تھا۔ وہ یقیناً یہ جاننا چاہتا تھا کہ اگر مروان برغوثی کو اچانک رہا کر دیا جائے تو کیا ہوگا یعنی اُن کی رہائی سے پورے علاقے میں کیا تبدیلی رونما ہوگی۔ کیا مروان برغوثی احتجاج کریں گے؟ کوئی عہدہ چاہیں گے یا لڑیں گے؟

اسرائیل اور فلسطین کے درمیان جاری رہنے والی لڑائی میں یہ ایک اہم لمحہ ہے۔ تمام اندازوں کے مطابق معاملات بہت مایوس کن ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں ناروے کے دارالحکومت اوسلو میں طے پانے والے معاہدے سے معاملات کے بہتر ہونے کی امید پیدا ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب فلسطینی اور اسرائیلی مجموعی طور پر پُرامن بقائے باہمی کی طرف جائیں گے۔ یہ امید برسوں پہلے دم توڑ گئی۔ اِس وقت غزہ میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اسرائیل کے قیام سے اب تک کا خطرناک ترین اور سنگین ترین لمحہ ہے۔ ۷/اکتوبر سے اب تک ۴۰ ہزار سے زائد فلسطینی شہید ہو چکے ہیں اور اِس دوران ۱۵۰۰ سے زائد اسرائیلی بھی موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ بیشتر ہلاکتیں عام شہریوں کی ہیں۔ اسرائیل کے وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو نے اب تک لڑائی روکنے کا کوئی عندیہ نہیں دیا ہے۔

بنیامین نیتن یاہو پر اسرائیلی یرغمالیوں کو حماس سے چُھڑوانے کے لیے غیر معمولی دباؤ کا سامنا ہے۔ ایسا قیدیوں اور یرغمالیوں کے تبادلے کی صورت ہی میں ممکن ہو سکتا ہے۔ اس حوالے سے جاری مذاکرات سے وابستہ ایک شخصیت نے بتایا کہ مروان برغوثی کا نام فہرست میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اگر مروان برغوثی کو رہا کیا گیا تو غزہ کے قضیے کی حرکیات تبدیل ہو جائیں گی۔ فلسطینی اتھارٹی کے سربراہ محمود عباس کے مقابلے میں مروان برغوثی کی مقبولیت زیادہ ہے۔ سیکولر دھڑے سے ہونے کے باوجود حماس کے کمانڈرز بھی مروان برغوثی کا احترام کرتے ہیں۔ وہ حماس کے تصورات کے برعکس دو ریاستوں کے نظریے کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مروان برغوثی عبرانی بھی روانی سے بولتے ہیں اور وہ بھی لہجے کے بغیر۔ بہت سے اسرائیلی سیاست دان مروان برغوثی کو اپنا دوست قرار دیتے ہیں۔

اسرائیل کی داخلی سلامتی کے ادارے شِن بیت کے سابق سربراہ ایمی آیالون کہتے ہیں کہ واحد فلسطینی لیڈر جو دو ریاستی نظریے پر یقین رکھتا ہے اور کسی بھی اسرائیلی لیڈر کے مقابلے میں الیکشن جیت سکتا ہے، مروان برغوثی ہے۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ مروان برغوثی کا فلسطینی انتخابات میں حصہ لینا ہمارے یعنی اسرائیل کے مفاد میں ہے۔

بہت سے اسرائیلیوں کا یہ بھی خیال ہے کہ مروان برغوثی اب امن میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے۔ اور یہ کہ ان کی رہائی اسرائیلیوں کے لیے ایک ڈراؤنا خواب ثابت ہوگی۔ حماس کے موجود سربراہ یحییٰ سنوار کو ۲۰۱۱ء میں قیدیوں کے تبادلے ہی میں رہا کیا گیا تھا اور انہوں نے بعد میں اسرائیل کے خلاف زیادہ فعال ہو کر بالآخر ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کے حملوں کی منصوبہ بندی کی۔ ایک ریٹائرڈ انٹیلی جنس چیف کا کہنا ہے کہ مروان مرغوثی بھی اُتنا ہی بُرا اور خطرناک ہے، جتنی حماس ہے۔ جیل میں وہ تبدیل نہیں ہوا ہے بلکہ مزید انتہا پسند اور خطرناک ہو گیا ہے۔ پورے یقین سے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ مروان برغوثی کے ذہن میں اب کیا چل رہا ہے، وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ آخری انٹرویو انہوں نے دو عشرے پہلے دیا تھا اور ان کی اب تک کی آخری تصویر کم و بیش دس سال پرانی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ فلسطینیوں کے لیے نیلسن مینڈیلا ثابت ہوں گے؟

۱۹۱۷ء میں برطانوی سامراج کے قبضے میں آنے تک فلسطین کا خطہ سیکڑوں برس سلطنتِ عثمانیہ کے زیرنگیں رہا۔ برطانوی سلطنت کو بہت جلد یقین ہو گیا کہ اس خطے کو اپنے زیرِنگیں رکھنا دردِسر ہوگا کیونکہ یہاں یہودیوں اور فلسطینیوں کے درمیان سیکڑوں برس پرانا تنازع اب تک زندہ ہے۔ برطانوی حکمرانوں نے فریقین سے جو وعدے کیے، اُن سے معاملات مزید بگڑ گئے۔ فلسطین میں مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے مقدس ترین مقامات ہیں۔ مسلمان اور یہودی یکساں طور پر برطانوی قبضے کے خلاف تھے۔ کبھی کبھی یہ اختلاف شدید اور پُرتشدد شکل اختیار کر لیتا تھا۔

۱۹۴۸ء میں برطانیہ اس خطے سے نکل گیا اور نوزائیدہ

اسرائیلی ریاست اپنے عرب پڑوسیوں سے لڑائیوں میں الجھ گئی۔ آزادی کی لڑائی کے دوران اسرائیلی فوج نے ہزاروں فلسطینیوں کو اُن کے گھروں سے نکال دیا اور پھر اُنہیں واپس آنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔

مروان برغوثی ۱۹۵۰ء کے عشرے کے اواخر میں غربِ اردن میں پیدا ہوئے۔ یہ علاقہ اسرائیل کی متعین کردہ گرین لائن سے باہر اور اُردن کے زیرِ تصرف تھا۔ یہ گھرانہ ۹ افراد پر مشتمل تھا اور دو کمروں کے مکان میں ٹھُنس کر رہتا تھا۔ تل ابیب کی سفید عمارت بوہوس وہاں سے بہت دور تھی مگر دکھائی دیتی تھی۔ گاؤں میں معاش کے ذرائع محدود تھے۔ مروان کے والد بلڈر تھے اور کام کی تلاش میں اُنہیں کبھی کبھی بیروت تک جانا پڑتا تھا۔

۱۹۷۷ء کی جنگ میں جب اسرائیل نے مشرقی بیت المقدس، غزہ اور غربِ اردن پر قبضہ کیا تب مروان کی عمر ۸ برس تھی۔ اب یہ گھرانہ اسرائیل کے زیرِ تسلط جینے پر مجبور ہوا۔ اُن کے پڑوسیوں کو فلسطینی پرچم لہرانے پر مارا پیٹا گیا اور گرفتار بھی کیا گیا۔ اُن کے گاؤں کے گرد اسرائیلی فوجی اڈے اور یہودیوں کی آبادیاں ابھرنے لگیں۔ مروان کے گھرانے کے پالتو کتے کو اسرائیلی فوجیوں نے محض بھونکنے پر مار ڈالا۔

بچپن کے دوستوں کا کہنا ہے کہ مروان نے کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا جو اس وقت فلسطین کے مقبوضہ علاقوں میں بہت مقبول تھی۔ بیشتر جماعتیں چاہتی تھیں کہ اسرائیل کا نام و نشان مٹ جائے جبکہ کمیونسٹ پارٹی کا ایجنڈا یہ تھا کہ دو ریاستوں کا نظریہ مقبول ہو اور قتل و غارت کے بغیر ساتھ ساتھ رہنے کی گنجائش پیدا کی جائے۔ اسکول کے اوقاتِ کار ختم کرنے کے بعد مروان مرکزی رام اللہ میں ہونے والے مظاہروں اور احتجاج میں شریک ہوا کرتے تھے۔ جب وہ اسکول یا سیاسی سرگرمیوں میں مصروف نہیں ہوتے تھے تب اپنے والد کا ہاتھ بٹاتے تھے جو اُن دنوں ایک رشتہ دار کے مکان کی توسیع میں مصروف تھے۔

کچھ ہی وقت میں مروان کو محسوس ہونے لگا کہ اُن کے لیے پیش رفت ممکن نہیں ہو پارہی۔ اب انہوں نے کوئی اور پلیٹ فارم ڈھونڈنا شروع کردیا۔ کئی گروپ فلسطین کی نمائندگی کے لیے کوشاں تھے۔ ان میں تنظیمِ آزادی فلسطین (پی ایل او) معروف ترین تھی۔ یہ فتح نامی تحریک کے تحت تھا۔ یہ گروپ چھپ کر کام کرتا تھا اور لبنان کی سرزمین سے اسرائیل پر حملے کرتا تھا۔ مروان اِس کی طرف بڑھتے گئے۔

جب وہ اٹھارہ سال کے ہوئے تو اِس سے پہلے کہ وہ خاندان کی ایک لڑکی فدوہ سے شناسا ہو پاتے، ایک رات انہیں کو بر میں اُن کے گھر پر چھاپے کے دوران گرفتار کرلیا گیا۔ جیل کے گارڈز نے غلاظت کا ایک تھیلا اُن کے سر سے باندھا، اُنہیں بے لباس کیا اور اُن کے جسم کے نازک حصوں پر مار پیٹ کی حتیٰ کہ وہ بے ہوش ہوگئے۔ جب وہ ہوش میں آئے تو گارڈز نے اُنہیں طعنے دیے کہ وہ اب کبھی باپ نہیں بن پائیں گے۔

مروان کے بھائی کے بقول اُن پر ایک دہشت گرد تنظیم کا حصہ ہونے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ روس کے اشاروں پر کام کر رہے تھے۔ اگلے چار سال تک وہ جیل میں بند رہے۔

جیل میں بیشتر قیدیوں کا تعلق بڑے شہروں سے تھا اور یوں مروان جیسے دیہی کلچر کے لڑکے کو پہلی بار اُن لوگوں کے ساتھ رہنے کا موقع ملا جو پڑھے لکھے تھے۔ ان قیدیوں کو اُن کے گھر والے کتابیں فراہم کیا کرتے تھے۔ یوں اُن کے ساتھ ساتھ مروان کو بھی مطالعہ کا موقع ملا۔ جب سزا ختم ہونے کو آئی تو مروان نے اپنے بھائی سے کہا کہ وہ فدوہ کے والد سے بات کریں اور یوں ۱۹۸۳ء میں جیل سے رہائی کے کچھ ہی دنوں کے بعد مروان اور فدوہ کی شادی ہوگئی۔

مروان نے فلسطین کی ایک سرکردہ جامعہ بیرزیت میں داخلہ لیا جہاں انہوں نے تاریخ اور سیاسیات کی تعلیم پائی۔ انہوں نے سیاست ترک نہیں کی اور چند برس تک فلسطین پر اسرائیلی قبضے کے خلاف کیمپس میں ہونے والے ہر احتجاج میں حصہ لیا اور وہ بھی قائدانہ کردار ادا کرتے ہوئے۔ پہلے بیٹے کی پیدائش سے قبل ہی انہیں دوبارہ گرفتار کرلیا گیا۔

اِس بار انہیں ۶ ماہ کے لیے قید کیا گیا۔ اس دوران مروان نے جیل میں آنے والے عبرانی زبان کے اخبارات پڑھنے میں مہارت حاصل کرلی اور جیل کے گارڈز سے وہ گارڈز کے سوالوں کے جواب میں توراۃ کی آیات کا حوالہ دینے لگے۔ جیل میں چند ساتھیوں نے اسرائیل کی اوپن یونیورسٹی میں تاریخ کی کلاسز میں داخلہ لیا۔ درسی کتب میں مروان کی دلچسپی برائے نام تھی۔ انہوں نے یہودیوں کے عسکریت پسند گروپوں کے بارے میں مطالعہ کیا جنہوں نے اسرائیل کے قیام کی راہ ہموار کی۔ (---جاری ہے!)

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Marwan Barghouti, the world's most important prisoner". ("The Economist". July 22, 2024)

بقیہ: اسرائیل کو انتہائی مطلوب

یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران وہ اخوان المسلمون کے اسٹوڈنٹ ونگ 'اسلامی بلاک' کے سربراہ بھی رہے۔

سنوار ۱۹۸۵ء میں اخوان المسلمون کے سکیورٹی ونگ کے بانیوں میں سے ایک تھے، جسے 'مجد' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کا بنیادی ہدف غزہ کی پٹی میں اسرائیلی قبضے کے خلاف مزاحمت کرنا تھا۔

جیل سے سیکھا گیا سبق

سنوار ویسے تو میڈیا سے دور رہے ہیں لیکن انہوں نے بعض اہم مواقعوں پر بین الاقوامی میڈیا کے ساتھ پریس کانفرنسیں بھی منعقد کی ہیں۔

امریکی ادارے این پی آر کے نامہ نگار ڈینیئل الیسٹرن نے ۲۰۱۸ء میں ایسی ہی ایک پریس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔

ان کے مطابق سنوار نے کہا کہ وہ اپنی حکمتِ عملی اسرائیل کی جیلوں میں سیکھے گئے سبق کی مدد سے تشکیل دیتے ہیں۔ سنوار نے بتایا تھا کہ 'جیسے جیل میں قیدی اپنے حقوق کے لیے بھوک ہڑتال کرتے ہیں، ویسے ہی فلسطینی غزہ کے حالات میں بہتری کے لیے اپنے جیلروں کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں'۔

الیسٹرن کہتے ہیں کہ حماس کے مستقبل کا دارومدار بہت حد تک سنوار پر ہے، اس لیے اسرائیل، جس نے حماس کو ختم کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے، سنوار کو اپنی ہٹ لسٹ میں شامل کر رکھا ہے۔

اسرائیل کی سنوار کو سمجھنے میں ناکامی

اسرائیل کے پاس سنوار سے نمٹنے کا تقریباً ۴۰ سال کا تجربہ ہے، تاہم وہ سنوار کو سمجھ نہیں پائے اور اسی وجہ سے وہ اطمینان کے جھوٹے احساس میں مبتلا ہوگئے۔

سات اکتوبر کے حملے سے قبل اسرائیل سنوار کو ایک 'خطرناک انتہا پسند' کے طور پر دیکھتا تھا، البتہ 'ٹائمز آف اسرائیل' کی ایک رپورٹ کے مطابق اسرائیل نے انہیں حقیقی خطرہ نہیں سمجھا، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ سنوار کی توجہ غزہ میں حماس کی حکمرانی کو مضبوط کرنے اور معاشی مراعات حاصل کرنے پر مرکوز ہے۔

فاکس نیوز کی ایک رپورٹ کے مطابق تل ابیب یونیورسٹی کے دیان سینٹر میں فلسطینی اسٹڈیز فورم کے سربراہ مائیکل ملسٹائن نے کہا کہ 'سنوار حماس رہنماؤں کی دوسری نسل کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کے پاس نہ صرف غزہ کے معاملات بلکہ پوری تحریک کی قیادت کرنے کی صلاحیت ہے'۔

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۷ اگست ۲۰۲۴ء)

غزہ جنگ بندی معاہدہ، تخت بھی اور تختہ بھی!

منصور جعفر

امریکی وزیر خارجہ ۷/اکتوبر سے اب تک اپنے نویں دورے پر اسرائیل اور خطہ کے دیگر ملکوں میں پہنچے ہوئے ہیں۔ ان کی حالیہ دنوں کی بے چینی اور اضطراب سے اب صاف لگنے لگا ہے کہ اسرائیل کی غزہ میں جاری جنگ اور اپنے اڑوس پڑوس پر بمباری وحملہ بازی اب امریکی جو بائیڈن انتظامیہ کو براہ راست اپنے اوپر بھی حملہ محسوس ہونے لگا ہے۔

اس حملے کی اس 'انڈر اسٹینڈنگ' سے پہلے جس قدر زیادہ جاری رکھنا ضروری تھا اب اس سے کہیں زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے روکا جائے۔ اسی لیے امریکی وزیر خارجہ اینٹنی بلنکن اس موقع کو آخری موقع قرار دے رہے ہیں۔

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ پورے امریکا کی اس وقت یہ بے چینی نہیں ہے۔ یہ بے چینی جو بائیڈن انتظامیہ اور ڈیموکریٹس کی اس وقت زیادہ ہے۔ ڈیموکریٹس کو اس کی شدت کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب اسرائیلی جنگ میں کھلی جنگی، فوجی، اسلحے اور سفارتی وسیاسی کے ساتھ ساتھ مالی معاونت پر خود امریکا میں ردعمل شدید ہوگیا۔

اتفاق سے یہ صورتحال رواں سال کے ان لمحوں میں زیادہ محسوس کی گئی جب صدر جو بائیڈن کو اپنی دوسری صدارتی مدت کے لیے انتخابی مہم شروع کرتے ہوئے مختلف طبقوں کی طرف سے سخت مزاحمت اور مخالفت کی صورتحال ملنے لگی۔

ان طبقات میں امریکی سیاہ فام، عرب امریکن، امریکی مسلمان، خواتین، نوجوان، طلبہ ہی شامل نہیں تھے وہ ڈیموکریٹس اور ڈیموکریٹ ووٹر بھی شامل تھے جن کے ہراول دستے کے طور پر کئی سفارت کار تک اسرائیل کے لیے اندھی حمایت کی پالیسی پر مستعفی ہوکر گھروں کو چلے گئے تھے۔

جو بائیڈن انتظامیہ کو سفارت کاروں اور بعض دیگر حکام کے ان استعفوں کا سامنا چونکہ ایک درجن سے کم تعداد میں تھا اس لیے اس سے معاملے کی شدت کا احساس کرنے میں جو بائیڈن اور ان کی نائب کملا ہیرس کو کافی دیر لگ گئی لیکن جب شدت محسوس ہوئی تو گویا دوڑیں لگ گئیں۔

نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ جو بائیڈن کا بطور صدارتی امیدوار میدان میں رہنا ممکن نہ رہا۔ یہ بہت کم لوگ جان اور سمجھ سکے ہیں کہ جو بائیڈن کی جگہ کملا ہیرس کو آگے لانے کی حقیقی وجہ جو بائیڈن کا 'بڑھاپا' اور 'بھلکڑ پن' نہ تھا بلکہ اسرائیل نواز پالیسی اور غزہ میں انسانوں کا اندھا قتل عام ہی تھا، جس کے بعد امریکا کے عام ووٹرز ہی نہیں ڈیموکریٹس بھی پھٹ پڑے تھے۔ مزید سمجھنے کے لیے کہ جو بائیڈن کی عمر اور 'بھلکڑ پن' یا صحت کے سارے ایشوز ڈیموکریٹس کے کافی عرصے سے علم میں تھے۔ یہ بات سب لوگ جانتے تھے، جو بائیڈن امریکا کے دس عمر رسیدہ ترین صدور میں سے اب بھی غالباً سرفہرست ہیں۔

جبکہ دوسری بار صدر بننے کی صورت میں ان کی پیرانہ سالی اور زیادہ ہوجائے گی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ۲۱ جولائی سے پہلے تک باضابطہ صدارتی امیدوار تھے اور ماہ جون کے اواخر تک کوئی ایسا شور نہیں تھا۔

جب ڈونلڈ ٹرمپ کے ساتھ مباحثے میں جو بائیڈن کی کارکردگی خراب رہی تو احساس ہوا کہ غزہ میں اسرائیلی جنگ کی مسلسل حمایت کے خلاف امریکا میں پایا جانے والا ردعمل جو اب ڈیموکریٹس کے اندر تک گھس چکا ہے۔ ٹرمپ کے مقابلے میں جو بائیڈن کی کارکردگی کے ساتھ مل کر دو آتشہ ہو گیا تو ٹرمپ کو ایک بار پھر وائٹ ہاؤس پر براجمان ہونے سے روکنا غیر ممکن ہوجائے گا۔

امریکی صدر جو بائیڈن غزہ میں اسرائیلی جنگ کی اپنی صدارتی مہم اور اور صدارتی انتخاب پر حملے کی شدت کو محسوس کر چکے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ماہ جون سے بھی پہلے ۳۱ مئی کو تین مراحل پر مشتمل اپنا مشہور زمانہ جنگ بندی فارمولا پیش کیا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی 'یوٹرن' تھا۔

اس سے قبل جو بائیڈن انتظامیہ تین بار اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں غزہ جنگ بندی کی قراردادوں کو ویٹو کر چکی تھی، مگر اب خود صدر جو بائیڈن جنگ بندی فارمولا بنا کر پیش کر رہے تھے۔ صرف یہی نہیں ۱۰/جون کو امریکی کوششوں سے سلامتی کونسل نے اس جنگ بندی فارمولے کی بنیاد پر جنگ بندی کی حمایت کردی۔ بلاشبہ یہ امریکی سفارتی کوشش کے بغیر ممکن نہ تھا۔

اگر آج اسے دیکھا جائے تو ایک دلچسپ حقیقت سامنے ہے کہ صدر جو بائیڈن جنہیں ۲۰۲۰ء میں آٹھ کروڑ سے زائد امریکیوں نے ووٹ دیے تھے سلامتی کونسل اور فلسطینی تحریک مزاحمت حماس کم از کم اس جنگ بندی کے حوالے سے ایک صفحے پر ہیں۔ گویا حماس کو 'دہشت گرد' کہنے کے باوجود امریکا اور اسرائیل دونوں اس کے ساتھ مذاکرات بھی کر رہے ہیں۔

جب امریکا کے اکثریتی عوام، سلامتی کونسل، امریکی صدر اور حماس بھی ایک پیج پر آچکے ہیں تو حماس کو 'دہشت گرد' قرار دینے کا معاملہ کیونکر باقی رکھا جاسکتا ہے۔

حماس بھی تو حالیہ دنوں ہونے والے مذاکرات سے پہلے، مذاکرات کے دوران اور بعد ازاں یہی کہہ رہی ہے کہ جنگ بندی ہونی چاہیے مگر تین کلیدی نکات کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔

اول یہ کہ جو بائیڈن فارمولہ آنے کے بعد دو جولائی کو حماس، اسرائیل اور امریکا سب جنگ بندی معاہدے پر اتفاق کر چکے ہیں، اس لیے ۱۵/اگست کے مذاکرات اسی متفق علیہ مسودے سے آگے بڑھنے چاہیے تھے۔ ثانیاً یہ کہ امریکی صدر جو بائیڈن کے پیش کردہ فارمولے کو چونکہ پہلے حماس اور اسرائیل نے قبول کرلیا تھا اور اس پر اتفاق کرتے ہوئے دو جولائی کو معاملات طے ہوئے تھے تو انہیں اب راستے میں چھوڑ کر نئی تجاویز کا پنڈورا باکس نہ کھولا جائے۔ ثالثاً یہ کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ۱۰/جون کو جو قرارداد منظور کی تھی اسے نیتن یاہو اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے نظر انداز نہ کیا جائے۔ لیکن نیتن یاہو اور ان کا بھیجا گیا وفد ماضی کی طرح ایک بار پھر نئی تجاویز کے ساتھ تھا۔

اسرائیل کی حکمت عملی مذاکرات شروع ہوتے ہی زیادہ شدید بمباری اور زیادہ اموات کا اہتمام کرنا رہی ہے۔ وہیں اس کی حکمت عملی کا یہ پہلو بھی جنگ بندی مذاکرات کی ایک نشست کے لیے ایک وفد بھیجا تو اگلی نشست کے لیے نئے وفد کی تشکیل کر دی، تاکہ بات پھر سے صفر سے شروع کرنے کا موقع بنتا رہے۔

یہ سب امریکا کو قبول اور پسند رہا ہے۔ مگر اب معاملہ یہ ہے کہ امریکا کے صدارتی انتخاب میں جب صرف اڑھائی ماہ باقی ہیں تو جو بائیڈن انتظامیہ اور ڈیموکریٹس کے لیے مزید 'رسک' لینے کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے۔ لہٰذا اینٹنی بلنکن پوری شرح صدر اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے جنگ بندی کے اس موقعے کو آخری موقع قرار دے رہے ہیں۔

اسرائیلی صدر اضحاک ہرتصوغ کے ساتھ ان کی پیر کے روز کی ملاقات میں ان کے چہرے کے سارے تاثرات یہی چغلی کھا رہے تھے۔

ڈیموکریٹ صدارتی امیدوار کملا ہیرس کے پاس الیکشن میں جو چیزیں عوامی توجہ حاصل کرنے کے لیے اہم ترین ہیں

ان کی فہرست زیادہ طویل نہیں ہے۔ ایک کامیابی تو حاصل کرلی گئی کہ اسرائیلی جنگ میں اسرائیلی قیادت سے زیادہ اہم کردار ادا کرنے والے جو بائیڈن کو پیچھے کردیا گیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود ڈیموکریٹ ووٹروں، سیاہ فام ووٹروں، عرب ووٹروں، مسلمان ووٹروں، خواتین ووٹروں اور طلبہ برادری کو الیکشن سے پہلے یہ باور کرانا ضروری ہے کہ جو بائیڈن انتظامیہ غزہ میں جنگ بندی کرانے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ بلاشبہ جنگ بندی کی ایسی کسی کامیابی کے بغیر ۴۰ ہزار فلسطینیوں کی کٹی پھٹی لاشوں کے ساتھ کملا ہیرس بھی الیکشن جیتنے میں بڑی مشکلات محسوس کریں گی کہ ان ۴۰ ہزار لاشوں میں بچوں اور عورتوں کی لاشوں کے ٹکڑے اور چیتھڑے زیادہ ہیں۔

اس لیے صرف یہ دعویٰ کہ وہ ایک عورت ہیں اور سفید فام بھی نہیں قبولیت پانے کے لیے کافی نہیں ہوگا۔ علاوہ ازیں لاکھوں 'ان کمٹڈ' ووٹرز بھی شکاگو میں ہزاروں مظاہرین کے ساتھ شامل تھے اور کملا ہیرس کو 'بمبالا ہیرس' کے نام سے یاد کر رہے تھے۔ یہ مظاہرین نسل کشی بند کرانے کا مطالبہ بھی کر رہے تھے اور نسل کشی میں امریکی شراکت داری روکنے کی بات بھی کر رہے تھے۔

کملا ہیرس کی انتخابی مہم کے اس مرحلے پر ایک مشکل یہ ہے کہ اس موقع پر امریکی مظاہرین کو 'یہود مخالف' کا الزام لگا کر بھی اطمینان سے نہیں بٹھایا جاسکتا ہے کہ بنگلادیش کی ایک خاتون وزیراعظم حسینہ واجد ایسا ہی الزام 'رضا کار' لگا کر اب بھارت میں چھپی بیٹھی ہیں۔

عوامی مطالبات کو نظر انداز کرنے کے لیے الٹا ان پر الزام جڑ دینا ہر وقت کسی حکمران کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ خصوصاً جب سوشل میڈیا کا ہتھیار بھی عوام کے ہاتھ میں ہے۔ جس کے ذریعے بنگلادیش میں عوام بیک زباں ہوکر کہنے لگے ہاں ہم رضا کار ہیں۔

کملا ہیرس اور جو بائیڈن انتظامیہ کے لیے غزہ جنگ بندی معاہدے کی اہمیت اس تناظر میں اور بھی زیادہ ہے کہ اس میں ایک سو سے زائد اسرائیلی یرغمالیوں کی رہائی کا معاملہ بھی شامل ہے۔ ابھی ایک روز قبل ہی ۷۹ سالہ یرغمالی غزہ میں ہلاک ہوا ہے۔ جو بائیڈن فارمولے کے تحت اگر معاہدہ نہیں ہوتا تو امریکا میں بہت سے یہودی ووٹر ڈونلڈ ٹرمپ کی باتوں میں آسکتے ہیں۔ یوں غزہ کے حوالے سے معاہدے کا ہونا کملا ہیرس کی انتخابی ضرورت سے زیادہ مجبوری بن چکا ہے۔

اگر بلنکن خلائی فاصلے کو کم کرنے کی مہم سے کامیاب لوٹتے ہیں تو ٹرمپ کو نیچے کی طرف جمپ کرنے پر مجبور کرنا ممکن ہوسکتا ہے۔ بصورت دیگر ۲۱ جولائی سے ۲۱ راگست تک کملا ہیرس کی ایک ماہ کی مہم کے دوران جو بہتری کی علامات ہیں یہ اگلے اڑھائی ماہ میں تحلیل بھی ہوسکتی ہیں۔

التابعین اسکول میں ۱۰۰ سے زائد فلسطینیوں کی ہلاکت کا بھی کملا ہیرس کو امریکا میں جواب دینا پڑا ہے کہ امریکی مظاہرین ہر جگہ پہنچ رہے ہیں جیسا کہ ڈیموکریٹک پارٹی کے نیشنل کنونشن میں بھی پہنچے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آنے والے دنوں میں اسرائیلی فوج جو بلاشبہ سب سے زیادہ امریکی اسلحے سے ہی لیس ہے کیا غزہ کے اسکولوں، اسپتالوں اور پناہ گزین کیمپوں پر حملے کرکے بچوں اور عورتوں کی لاشوں کے چیتھڑوں کے ساتھ امریکا کے صدارتی الیکشن اور بطور خاص ڈیموکریٹس کے صدارتی انتخاب پر حملہ آور نہیں ہوگی؟

آخر نیتن یاہو اور ان کے انتہا پسند ساتھیوں ایتمار بین گویر اور بذالیل سموٹریچ کو بھی اسی غزہ کی جنگ سے اپنا اگلا الیکشن جیتنے کا سامان کرنا ہے۔ اسی مقصد کے لیے اسرائیلی یرغمالیوں کی رہائی کو انہوں نے اب تک پس پشت ڈال رکھا ہے تو وہ کیوں مغربی کنارے اور اقصیٰ پر یہودی آبادکاروں کی قیادت کرتے ہوئے غزہ کے ملبے اور بھوکے ننگے قحط زدہ فلسطینیوں کو تاراج کرنے کے سلسلے میں کمی لائیں گے۔

گویا غزہ کے فلسطینی بچوں اور عورتوں کی لاشوں پر اقتدار کے محل تعمیر کرنے میں ہر کوئی لگا ہوا ہے۔ سنا ہے کہ ابو مازن بھی غزہ جنگ کے گیارہویں مہینے میں اظہار یکجہتی کے لیے غزہ میں اپنی شاہی سواری پر آنے والے ہیں۔

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۱ راگست ۲۰۲۴ء)

تُرک خلافت پر یہودی حملہ

رضی الدین سید

ڈون جوزف لسنے ایک یہودی سردار تھا۔ عثمانی ترک شہزادے سلیم اور سلطان سلیمان کے ساتھ اس کے گہرے تعلقات تھے، ۱۶۵۱ میں اس نے ترک شاہی خاندان سے طبریہ سمیت سات دیہات کی عملداری حاصل کرلی تھی جہاں اس نے سیکڑوں ہسپانوی یہودی لاکر بسائے تھے اور پوری آبادی کے گرد ایک فصیل بنادی تھی۔ (اس دور میں پورے مغربی یورپ میں یہودیوں پر بدترین مظالم ڈھائے جارہے تھے اور وہ پناہ کے لیے دربدر مارے پھر رہے تھے۔ ڈون جوزف لسنے نے ترکستان میں یہ بستی اپنے یہودی بھائیوں کی پناہ کے لیے بنائی تھی)۔ اسے دنیا کی پہلی چھوٹی یہودی ریاست کہا جاسکتا ہے۔

عثمانی خلافت کا اصل زوال اٹھارہویں صدی میں شروع ہوا تھا۔ ترک حکومت کمزور ہوئی تو بیرونی سفارت کاروں نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا اور خصوصی سفارتی مراعات کی آڑ میں ترکوں کی دولت خوب لوٹی۔ اس لوٹ مار میں عیسائی اور یہودی برابر کے شریک تھے۔ لہٰذا اس دور کے ترک خلیفہ عبدالحمید ثانی کو خطرے کا احساس ہوا۔ چنانچہ جون ۱۸۸۲ء میں اس نے ایک حکم کے ذریعے ترکی میں یہودیوں کی مزید آبادکاری پر پابندی لگادی۔ تاہم اس اقدام پر روسی حکومت نے (جو اس دور میں ترک حکومت کا دارالحکومت تھا) یہودیوں کو یقین دلایا کہ روسی حکومت انہیں تنہا نہیں چھوڑے گی۔ فروری ۱۸۸۴ء میں یہودیوں کی دو بڑی تنظیموں کے سربراہوں نے عثمانی وزیر خارجہ سے ملاقات کی۔ اس دوران پابندی کے باوجود فلسطین میں یہودیوں کی آمد و رفت جاری رہی جو اس وقت ترک خلافت کا حصہ ہی تھا۔ فائدہ اٹھاتے ہوئے عثمانی بیوروکریسی نے بھی ملک و قوم سے بے وفائی کرکے خوب دولت کمائی۔ اس کے کارندے بحری جہازوں پر یہودیوں کے ہاتھوں جعلی ویزے بیچنے کا دھندا علانیہ کرتے تھے۔

مشہور صیہونی رہنما اور تحریکِ اسرائیل کے بانی تھیوڈور ہرزل نے ۱۸۹۵ء میں ترک سلطان عبدالحمید کو بالواسطہ طور پر پیشکش کی کہ یونین بینک آف ویانا کے توسط سے جیوئش کانگریس اسے دو کروڑ عثمانی پونڈ دینے کو تیار ہے بشرطیکہ فلسطین اس کے حوالے کردیا جائے۔ اس کثیر رقم سے ترکی اپنے قرضے اتار سکتا تھا۔ (جنگ اول میں حصہ لینے کے باعث ترکی قرضوں کی دلدل میں پھنس چکا تھا)۔ مگر اس جسارت پر سلطان عبدالحمید نے اسے یہ جرأت بھرا مومنانہ جواب دیا کہ ''یہودی اپنی دولت اپنے پاس رکھیں۔ وہ میری لاش پر سے گزر کر ہی فلسطین حاصل کرسکتے ہیں''۔ اس دوٹوک جواب پر یہودی بوکھلا اٹھے۔

لیکن تھیوڈور ہرزل کے ذہن پر بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی بھی طرح عثمانیوں سے فلسطین حاصل کرلیا جائے۔ لہٰذا ۱۷ر مئی ۱۹۰۱ء کو وہ سلطان سے بذات خود ملا اور اس سے دو گھنٹے تک ملاقات کی۔ ہرزل نے اس بار بھی اپنی پیشکش دہرائی۔ لیکن خلیفہ نے اسے دوبارہ منہ توڑ جواب ہی دیا۔ کچھ عرصے بعد ہرزل نے سلطان سے آخری ملاقات کی اور بیت المقدس میں ایک یونیورسٹی کھولنے کی اجازت چاہی (اسے معلوم تھا کہ تعلیم کے ذریعے بھی نوجوانوں کو اپنے مقاصد کے لیے تیار کیا اور استعمال کیا جاسکتا ہے)۔ سلطان عبدالحمید ثانی نے یہ پیشکش بھی مسترد کردی۔ (صیہونی ہرزل ہر بار دھتکارا جاتا رہا لیکن بہرحال ہار نہیں مانی)۔

ترکوں کی جانب سے مایوس ہوکر اس مقصد کی خاطر اس نے پھر بین الاقوامی طور پر جدوجہد شروع کی۔ ۱۹۰۲ء میں وہ برطانوی اور ۱۹۰۳ء میں روسی حکام سے ملا۔ پھر اس نے آسٹریا اور جرمنی کے حکام سے بھی ملاقاتیں کیں۔ خوش قسمتی سے اس دور کے آنے تک یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کی دیرینہ لڑائی، دوستی میں تبدیل ہونے لگی تھی۔

۶ ستمبر ۱۹۰۳ء کو روسی وزیراعظم نے تھیوڈور ہرزل کو لکھا کہ ''سلطان ترکی عبدالحمید کو سرکاری طور پر مطلع کردیا گیا ہے کہ روسی حکومت یہودیوں کے فلسطینی منصوبے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ لہٰذا دونوں ملکوں (روس اور ترکی) کے درمیان دوستی کا رشتہ اسی وقت مضبوط رہ سکتا ہے جب سلطان، یہودیوں کی درخواست پر ہمدردانہ غور کرے''۔ (بیرونی قوتیں کس طرح مسلم حکومتوں کے اندرونی معاملات میں دخل انداز ہوتی ہیں، یہ اعلان اس کا واضح ثبوت ہے۔ حکمران لاکھ انکار کریں لیکن سفارتی تحفظات کی آڑ میں یہ کھیل آج بھی جاری ہے۔ انتخابات کے ایام میں ہمارے ملک میں امریکی سفیروں کی سیاسی قائدین سے کھلے عام ملاقاتیں اس کا بین ثبوت ہیں۔ یوں بھی ان بیرونی مغربی نمائندوں کا ملک میں تواتر سے آنا جانا اور حکومتی ذمے داروں کے ساتھ میل ملاقاتیں کرنا لگا رہتا ہے جسے ہماری حکومتیں اپنا فخر سمجھتی ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ ان وفود کی آڑ میں خود صیہونی نمائندے بھی یہاں اپنی آمد ورفت نہ رکھتے ہوں۔ سید)۔

عثمانی خلافت میں اس وقت تک ہر طرف بے چینی کے آثار پیدا ہوچکے تھے اور فوج میں بددلی پھیل رہی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں ترکی کے چند افسروں نے دمشق میں ایک خفیہ انجمن بنام ''وطن'' کی بنیاد رکھی جس میں مصطفیٰ کمال پاشا بھی شامل تھا۔ انجمن کا رکن بننے کی شرائط بہت سخت تھیں اور ارکان سے خنجر کی نوک پر حلف لیا جاتا تھا کہ اپنی اصلیت وہ کسی پر ظاہر نہیں کریں گے۔ بعد میں یہ تنظیم ترک فوجیوں کی ایک اور خفیہ تنظیم ''انجمن اتحاد وترقی'' میں ضم ہوگئی۔

یہودی اس تحریک کو خاصی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے کیونکہ انہیں احساس ہوگیا تھا کہ حکومت کے باغیوں سے مل کر وہ اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرواسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس چھوٹے سے ترک گروہ نے انجمن اتحاد وترقی کی بنیاد رکھی تھی، اس میں یہودی بھی شامل ہوگئے تھے جن کا ارادہ تھا کہ وہ رفتہ رفتہ نوجوان ترکوں کی اس تنظیم پر چھا جائیں گے۔ انجمن نے اپنی کارروائیوں کے لیے یہودی فری میسن تنظیم کے دفاتر بھی آزادانہ استعمال کیے تھے۔

سلطان عبدالحمید کے مخالفین بیرون ملک سے کئی اخبار نکال رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود سمجھتے تھے کہ محض مغربی پروپیگنڈے سے سلطان کا اقتدار سے ہٹنا ممکن نہیں ہے۔ انہیں یقین تھا کہ ایک داخلی بغاوت ہی اس کا بہترین حل ہے۔ چنانچہ آخر ۱۹۰۸ء میں 'انجمن اتحاد وترقی' نے بغاوت کردی اور اس کے فوجی دستوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلیا۔ حتیٰ کہ شاہی محل کے وفادار ملازم بھی اپنی وفاداریاں تبدیل کرکے انقلابیوں کے ساتھ مل گئے۔ سلطان اب بالکل تنہا ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس نے چند اصلاحات رائج کیں اور انتخابات کا اعلان کردیا۔ انجمن نے اس انتخاب میں دھونس، دھاندلی اور دباؤ سے اپنے آدمی کامیاب کروالیے۔ اور یوں حکومت پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔

۲۶ر اپریل ۱۹۰۸ء کو پارلیمان کا اجلاس ہوا اور اس میں اس مسئلے پر بحث ہوئی کہ سلطان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟ چونکہ انجمن کے ارکان، اسمبلی پر حاوی ہوچکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ترکی کے شیخ الاسلام پر اس قدر دباؤ ڈالا کہ اس نے سلطان عبدالحمید ثانی کی معزولی کا فتویٰ جاری کردیا۔

معزولی کا پروانہ پہنچانے کے لیے خلیفہ کے پاس جو وفد پارلیمان کی جانب سے بھیجا گیا تھا، اس میں وہ یہودی بھی شامل تھے جنہیں ۱۹۰۰ء میں سلطان نے اپنے قصر سے نکلوادیا تھا۔ اس طرح یہودیوں نے سلطان سے ذلت آمیز طریقے سے اپنا انتقام لے لیا۔ وہ سلطان عبدالحمید کی معزولی پر بے حد مسرور ہوئے۔

اسی زمانے میں پیرس میں یہودی رہنماؤں کا ایک خفیہ اجلاس ہوا جس میں ایک یہودی مندوب نے کہا کہ ''اگر ہرزل زندہ ہوتا تو (سلطان کی معزولی پر) خوشی سے پھولے نہیں سماتا جو کہتا تھا کہ اسے معزول کرنا ہی اس کی زندگی کا نصب العین تھا''۔

بعدازاں عثمانی خلافت کے آخری خلیفہ عبدالحمید کو دانستہ ایسے گھر میں نظر بند کیا گیا جو یہودی بینکار اور فری میسنری کے رکن شفیق رمزی کا تھا۔ دوسری جانب وہ انجمن اتحاد وترقی کا بھی سرگرم رکن تھا۔ خلیفہ کا وہیں انتقال ہوا۔

اس کے بعد سے اقتدار فری میسنری اور انجمن اتحاد و ترقی کے نوجوان رکن کیپٹن مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں میں منتقل ہوگیا جس نے آتے ہیں عربی زبان پر پابندی لگائی، ترکی کو مملکت کی سرکاری زبان قرار دیا اور عربی اذانیں بند کروائیں۔ جرنیلوں نے ایسا عسکری ڈھانچہ بنایا جس کے نتیجے میں فوج کے اندر عیسائیوں کو مؤثر قوت حاصل ہوگئی۔

ترکی صوبے سالونیکا میں اس وقت ۸۰ ہزار یہودی بس رہے تھے جو بہت اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ ان کا ایک مؤثر فرد عمانوئیل عثمانی نہ صرف انجمن اتحاد کا رکن تھا بلکہ ترک پارلیمان کا بھی رکن بن چکا تھا۔

۱۹۱۷ء کے آخر میں بالآخر وہ بیت المقدس بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا، خلفائے عثمانیہ جس کی صدیوں سے حفاظت کرتے چلے آرہے تھے۔

(حوالہ کتاب ''مشرقی یورپ میں مسلمانوں کا عروج وزوال'' از فیض احمد شہابی۔ باب عثمانی سلطنت کی ٹوٹ پھوٹ)

تمام سازشوں اور اکھاڑ پچھاڑ کے بعد آخرکار آخری کاغذی خلیفہ عبدالمجید (برادر عبدالحمید ثانی) کو بھی خلافت سے معزول کردیا گیا اور یہودیوں اور عیسائیوں کے طویل شیطانی گٹھ جوڑ کے بعد یوں آٹھ سو سالہ عثمانی خلافت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔ خلیفہ عبدالمجید کو فرانس جلاوطن کردیا گیا تھا۔

نہیں بھولنا چاہیے کہ یہودیوں اور صیہونیوں کی سازشیں بہت گہری، خطرناک، بے باک اور ہمہ گیر ہوتی ہیں۔ جس ملک میں بھی وہ رہتے ہیں، اسی کو ڈستے رہتے ہیں۔ لہٰذا اسرائیل کے حوالے سے ہمیں بھی انتہا سے زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔ ان کی پوری تاریخ دیکھ لی جائے، ہر ہر صفحے پر یہی خفیہ سازشیں اور قضیے نظر آئیں گے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ اگر ان صیہونیوں کو امریکا میں بھی جاکر بسا دیا جائے تو محض تیس سالوں میں وہ امریکا کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کردیں گے۔ جان رکھیں کہ یہ قوم آج تک کسی کی بھی دوست نہیں رہی ہے۔

ڈھاکا سے دہلی

حسینہ واجد کے پہلے ۲۴ گھنٹے کیسے گزرے؟

بنگلا دیش کی تاریخ کے ہنگامہ خیز دن یعنی پیر ۵/اگست کو ڈھاکا سے دو درخواستیں تقریباً ایک ہی وقت میں دہلی پہنچیں۔ بنگلا دیشی اخبار ''ڈھاکا ٹریبیون'' کے مطابق یہ درخواستیں حسینہ واجد کی جانب سے آرمی چیف سے ملاقات اور مستعفی ہونے کے فیصلے کے بعد بھیجی گئیں۔

پہلی درخواست براہ راست شیخ حسینہ واجد کی جانب سے بھیجی گئی جس میں انہوں نے بھارتی حکومت سے اجازت مانگی کہ انہیں بھارت آنے دیا جائیں۔

لگ بھگ اسی وقت ایک اور درخواست بنگلا دیش سے بھارت پہنچی جو کہ آرمی کی طرف سے تھی۔ آرمی کی جانب سے فوجی طیارے کی بھارت لینڈنگ کے لیے کلیئرنس مانگی گئی جو شیخ حسینہ واجد کو لے کر جا رہا تھا۔

بھارت کی جانب سے کلیئرنس ملنے کے بعد پیر کی شام بنگلا دیش کا فوجی طیارہ حسینہ واجد کو لے کر دہلی کے قریب اترا۔

یہ بات بھارت کے وزیر خارجہ ایس جے شنکر نے بھارت کے پارلیمان کے ایوان بالا میں دیے گئے بیان میں بتائی۔

شیخ حسینہ واجد نے پہلے ۲۴ گھنٹے کیسے گزارے؟

بھارت اترنے کے بعد شیخ حسینہ واجد کا استقبال نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر اجیت دوول نے کیا۔ اجیت دوول نے مودی کے نمائندے کی حیثیت میں شیخ حسینہ کا خیر مقدم کیا۔

اس کے بعد ایئر بیس کے لاؤنج میں چائے پر شیخ حسینہ اور اجیت دوول کے درمیان تفصیلی بات چیت ہوئی۔

شیخ حسینہ واجد کی بیٹی صائمہ واجد پوتل ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی ریجنل ڈائریکٹر کے طور پر گزشتہ برس سے دہلی میں مقیم ہیں۔ تاہم پیر کو صائمہ دہلی میں نہیں بلکہ تھائی لینڈ میں تھیں۔

شیخ حسینہ واجد کی دہلی آمد کے بعد انہوں نے تھائی لینڈ سے اپنی والدہ سے رابطہ کیا جس کے بعد وہ واپس دہلی کے لیے روانہ ہوگئیں۔ اس دوران شیخ حسینہ واجد کے بیٹے سجیب واجد جوئی نے امریکا سے کئی مرتبہ اپنی والدہ سے رابطہ کیا۔

واضح رہے شروع میں بھارت کا خیال تھا کہ شیخ حسینہ واجد کا قیام دہلی میں بہت مختصر ہوگا۔

شیخ حسینہ نے بھارت آنے کی اجازت مانگتے ہوئے بھی کہا تھا کہ وہ کچھ وقت کے لیے دہلی آئیں گی۔ اس لیے بھارتی حکام کا خیال تھا کہ شیخ حسینہ واجد کچھ گھنٹے دہلی میں گزارنے کے بعد کسی تیسرے ملک روانہ ہو جائیں گی۔

بھارتی حکام کو یقین تھا کہ تیسرا ملک برطانیہ ہوگا۔

یہ اس وجہ سے بھی تھا کہ شیخ حسینہ واجد کے ساتھ ان کی بہن شیخ ریحانہ بھی تھیں جن کے پاس برطانوی شہریت ہے۔

شیخ ریحانہ کی بیٹی ٹیولپ صدیق برطانیہ کی حکمران لیبر پارٹی کی سینئر رکن، رکن پارلیمان اور جونیئر منسٹر ہیں۔

شیخ حسینہ نے بھی لندن میں کافی وقت گزارا ہے۔ برطانیہ کی اقتدار سے برطرف ہونے والے حکمرانوں کو سیاسی پناہ دینے کی تاریخ کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ انہیں برطانیہ جانے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔

شیخ حسینہ واجد کا طیارہ دہلی میں اترا تو اس وقت بھارت کی وزارت خارجہ کے ایک عہدیدار نے نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بتایا تھا کہ وہ دہلی رُکی ہوئی ہیں اور کچھ دیر کے بعد لندن روانہ ہو جائیں گی۔

اس کے بعد بحث بھی شروع ہوگئی تھی کہ آیا بنگلا دیش کی فوج کا سی ون تھرٹی طیارہ ہی ان کو لے کر لندن جائے گا یا بھارتی طیارہ یا پھر وہ کمرشل پرواز کے ذریعے لندن جائیں گی۔ تاہم رات شروع ہوتے ہی یہ واضح ہوگیا کہ برطانیہ میں شیخ حسینہ واجد کو سیاسی پناہ دینے کا معاملہ اتنا آسان اور سیدھا نہیں ہوگا جس طرح ابتدا میں سوچا جا رہا تھا۔

پیر کو رات گئے دہلی میں برطانوی ہائی کمشنر نے بھارتی حکام کو آگاہ کیا کہ حسینہ واجد کی پناہ کی درخواست زیر غور ہے اور اس پر فیصلے میں وقت لگے گا۔

اس کے بعد کئی اسکینڈے نیوین ممالک بشمول فن لینڈ سے رابطہ کیا گیا کہ ان کو وہاں کم از کم عارضی سیاسی پناہ مل سکے۔ تاہم پیر اور منگل کی درمیانی رات اس معاملے پر کوئی مثبت پیش رفت نہیں ہوئی۔

اسی دوران بھارتی کابینہ کا ہنگامی اجلاس وزیر اعظم نریندر مودی کی رہائش گاہ پر ہوا جس میں بنگلا دیش کی صورتحال پر غور کیا گیا۔

جب یہ اندازہ ہوا کہ شیخ حسینہ اور ان کی بہن پیر اور منگل کی شب کسی تیسرے ملک روانہ نہیں ہو سکیں گی پھر ان کو ہنڈون ایئر بیس کے لاؤنج سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔

شیخ حسینہ واجد اور ان کی بہن کو اس کے بعد پیرا ملٹری فورس کے ہنڈون ایئر بیس سے دور غازی آباد میں واقع گیسٹ ہاؤس (سیف ہاؤس) میں منتقل کر دیا گیا۔ منگل کی شام تک شیخ حسینہ اور ان کی بہن اسی سیف ہاؤس میں رہیں۔

جب منگل کی صبح تک یہ واضح ہوا کہ شیخ حسینہ جلد تیسرے ملک نہیں جا سکتیں تو وزیر خارجہ ایس جے شنکر نے بھارتی حکومت کی جانب سے بنگلا دیش کی صورتحال پر بلائے گئے کل جماعتی اجلاس کو بتایا کہ فی الحال شیخ حسینہ واجد بھارت میں ہیں۔

ذرائع کے مطابق ایس جے شنکر نے بتایا کہ بھارتی حکومت نے شیخ حسینہ واجد کے ساتھ اس حوالے سے بات چیت کی ہے۔ 'حکومت ان کو اپنے مستقبل کے حوالے سے فیصلہ کرنے کے لیے مزید وقت دینا چاہتی ہے'۔

منگل کی صبح جب شیخ حسینہ کو بھارت لے کر آنے والے سی ون تھرٹی جہاز نے بھارت سے اڑان بھری تو بھارتی نیوز ایجنسی اے این آئی نے خبر چلائی کہ شیخ حسینہ دہلی سے روانہ ہو گئیں۔ تاہم کچھ دیر بعد اے این آئی نے خبر کی تصحیح کی کہ سی ون تھرٹی بنگلا دیش کے فوجی حکام کو لے کر ڈھاکا چلا گیا ہے اور اس میں حسینہ واجد موجود نہیں تھیں۔

اس طرح شیخ حسینہ واجد نے حکومت سے برطرفی کے بعد اپنے پہلے ۲۴ گھنٹے انتہائی بے یقینی کی کیفیت میں گزارے۔

(بحوالہ: ''اردو نیوز ڈاٹ کام''۔ ۷/اگست ۲۰۲۴ء)

●●●

بقیہ: کلاس روم میں مصنوعی ذہانت

ہے۔ وہ لوگ انتظامی سطح پر بھی کلیدی نوعیت کی تبدیلیاں یقینی بنانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اور یہ بات بھی یقینی بنائی جا رہی ہے کہ کسی بھی ٹیچر کو ایسے ٹولز استعمال کرنے پر مجبور نہ کیا جائے جو کلاس روم میں کارگر ثابت نہ ہوں۔

ایسا اس لیے ہے کہ حتمی تجزیے میں تو ٹیچر ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔ اگر انہیں موزوں ترین اور بہترین ٹولز دیے جائیں تو وہ اپنے طلبہ سے زیادہ اچھی طرح تعاون کر سکیں گے۔ نیو آرک اسکول کے دورے نے مجھ میں مصنوعی ذہانت سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے پیدا ہونے والی سہولتوں کے بارے میں نئی امید جگائی ہے۔ اب اساتذہ اہم ترین امور پر زیادہ توجہ مرکوز کر سکیں گے۔

"My trip to the frontier of AI education".
("gatesnotes.org". July 09, 2024)

بنگلادیش میں طلبہ تحریک

مسعود انور

گزشتہ پندرہ برس سے برسراقتدار حسینہ واجد کے ۵/اگست ۲۰۲۴ء کو بھارت فرار کے ساتھ ہی بنگلادیش میں ان کے اقتدار کا سورج غروب ہوگیا۔ پاکستان سے ۴۵ دن چھوٹی حسینہ واجد کی پیدائش ۲۸ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مشرقی بنگال کے علاقے تنگی پاڑہ میں ہوئی تھی۔ اِس وقت ان کی عمر ۷۷ برس کے لگ بھگ ہے۔ اِس طرح ان کے دوبارہ اقتدار میں آنے کے امکانات کم ہی ہیں۔ فوج کی جانب سے اقتدار پر قبضہ اور گرفتاری کی دھمکی کے بعد حسینہ واجد نے ۵/اگست کو ایوان وزیراعظم انتہائی عجلت میں چھوڑا اور وہ فوج کی حفاظت میں ایک کار میں روانہ ہوگئیں۔ پہلے ایک فوجی ہیلی کاپٹر کے ذریعے انہیں فضائیہ کے ہوائی اڈے پر پہنچایا گیا جہاں سے فضائیہ کے ہی سی۔۱۳۰/طیارے میں انہیں بھارتی دارالحکومت نئی دہلی کے قریب غازی آباد پہنچایا گیا۔ جہاں پر مودی کے خاص ساتھی اور مشیر برائے قومی سلامتی اجیت ڈووال نے سینئر فوجی افسران کے ہمراہ ان کا استقبال کیا۔ اس وقت حسینہ واجد نئی دہلی میں کسی خفیہ مقام پر ہاؤس اریسٹ ہیں۔ ان سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ حسینہ واجد کی بیٹی جو اقوام متحدہ میں ملازم ہیں، نئی دہلی میں موجود ہونے کے باوجود ان کو بھی حسینہ واجد سے ملنے کی بھارتی حکومت نے اب تک اجازت نہیں دی ہے۔

کہا گیا کہ عوامی جدوجہد نے حسینہ واجد کو حکومت چھوڑنے کے ساتھ ساتھ ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کردیا۔ کیا حقیقت میں ایسا ہی ہے؟ اس کے ساتھ ہی اور بہت سارے سوالات ہیں جن کے جوابات کہیں کہیں بین السطور تو ملتے ہیں مگر واضح طور پر کہیں موجود نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر کیا سچ مچ بنگلا دیش میں طلبہ تحریک اچانک شروع ہوئی، کیا یہ طلبہ تحریک کی شدت تھی جس سے حسینہ واجد کو شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا، کیا یہ بھارت، چین اور امریکا کی لڑائی تھی یا پھر یہ بنگلا دیش کا خالص اندرونی معاملہ تھا، کیا اس میں پاکستان کا بھی کوئی کردار تھا یا یہ محض بھارت کی الزام تراشی ہے اور سب سے اہم ترین سوال کہ اس تحریک کا مالی معاون کون تھا۔ کیا بنگلا دیش کی طلبہ تحریک کے ہمسایہ ممالک بھارت، سری لنکا اور پاکستان پر کوئی اثرات مرتب ہوں گے۔ پاکستان اور بنگلا دیش کی صورتحال میں کیا مماثلت ہے اور کیا مماثلت نہیں ہے۔ یہ اور ان جیسے کئی سوالات ہیں جو ذہن میں تو کلبلا رہے ہیں مگر ان کے جوابات کہیں پر موجود نہیں ہیں۔

ہر طرف سے محض وہ کچھ سامنے آرہا ہے جو اسٹیج پر پرفارم کیا جارہا ہے۔ اس کا اسکرپٹ کیا ہے، ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کون ہیں اور کلائمیکس کیا ہے، یہ کوئی نہیں بتا رہا۔ آیئے پہلے ان سوالات کے جوابات ایک ایک کرکے بوجھتے ہیں اور پھر ان نقاط کو جوڑ کر دیکھتے ہیں کہ کیا تصویر سامنے آتی ہے۔

موجودہ بنگلا دیش یا سابقہ مغربی بنگال میں طلبہ تحریک کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بنگلا دیش کو وجود میں لانے میں یونیورسٹیوں کے طلبہ نے اہم ترین کردار ادا کیا تھا، جن کی برین واشنگ ان کے ہندو اساتذہ کے ذریعے کروائی گئی تھی۔ جب سے بنگلا دیش کا قیام عمل میں آیا ہے، اس وقت سے لے کر اب تک طلبہ تحاریک کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ بنگلا دیش کی اگر حالیہ تاریخ کو ہی دیکھا جائے تو ۲۰۱۸ء میں طلبہ نے Road safety movement شروع کی تھی۔

یہ تحریک بھی اتفاق سے جولائی میں ہی شروع ہوئی تھی۔ یہ دو جولائی کی حبس زدہ صبح تھی، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی بارش بند ہوئی تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے کام کاج کی طرف رواں دواں تھے۔ ڈھاکا میں ائرپورٹ روڈ پر تین بسیں ریس لگا رہی تھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ مسافروں کو سمیٹ سکیں۔ ان میں سے ایک تیز رفتار بس ڈرائیور سے بے قابو ہوکر بس اسٹاپ پر کھڑے مسافروں سے جا ٹکرائی جس کے نتیجے میں شہید رمیز الدین کنٹونمنٹ کالج کے دو طالب علم جاں بحق ہوگئے جبکہ بارہ دیگر افراد زخمی ہوئے۔ جس کے بعد سیکڑوں طلبہ روڈ پر آگئے اور انصاف کا مطالبہ کرنے لگے۔ پاکستان، بنگلا دیش، بھارت میں اس جیسے واقعات معمولات میں شامل ہیں جہاں پر پولیس رشوت لے کر آنکھیں بند رکھتی ہے اور اس طرح کے حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ مگر جب ضرورت پڑتی ہے تو اس طرح کے حادثات ignition کا کام دیتے ہیں۔ سب کچھ پرامن تھا کہ بنگلا دیشی وزیر ٹرانسپورٹ شاہ جہاں خان کا ایک انٹرویو ٹی وی پر نشر ہوا جس میں وہ مسکراتے ہوئے کہتے ہیں کہ حال میں ہی بھارتی مہاراشٹر میں سڑک حادثہ میں ۳۳/افراد جان سے گئے، کیا وہاں پر بھی کسی نے اس طرح کا احتجاج کیا۔ شاہ جہاں کے اس احمقانہ بیان اور مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور اب مطالبہ حادثے کے ذمہ داروں کو کڑی سزا دینے، پبلک ٹرانسپورٹ کو ریگولیٹ کرنے سے بڑھ کر شاہ جہاں کے استعفیٰ تک جا پہنچا۔ شاہ جہاں کے احمقانہ طرز عمل کے نتیجے میں احتجاج کا دائرہ یونیورسٹیوں کے طلبہ تک پھیل گیا اور یوں پورا ڈھاکا مفلوج ہوکر رہ گیا۔

۲/اگست تک یہ مظاہرے پرامن تھے کہ پھر سرکار نے دوسرا احمقانہ کام کیا کہ مظاہرین کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس کے شیل فائر کیے اور ربڑ کی گولیاں چلائی گئیں۔ اس سے احتجاج کی لہر پورے ملک میں پھیل گئی۔ اب سرکار میں بیٹھی دوسری ٹیم نے اپنا کام شروع کردیا۔ یعنی انٹرنیٹ بند، سوشل میڈیا پر کریک ڈاؤن وغیرہ وغیرہ۔ دوسرا عوامی لیگ نے اپنا آزمودہ نسخہ آزمایا کہ پولیس کی چھتری میں عوامی لیگ اور اس کی طلبہ تنظیم کے کارکنان لاٹھیوں سے مسلح ہوکر مظاہرین پر ٹوٹ پڑے جس سے عوامی ردعمل میں مزید اضافہ ہوا۔ عوامی لیگ اور اس کی طلبہ تنظیم کے مسلح غنڈوں نے صرف مظاہرین کو ہی نشانہ نہیں بنایا بلکہ وہ اس کی کوریج کرنے والے اور غیر ملکی میڈیا کو انٹرویو دینے والے صحافیوں کو بھی تاک تاک کر نشانہ بنا رہے تھے، خواتین میڈیا کارکنان کو جنسی طور پر ہراساں کیا جارہا تھا۔ دوسری طرف ملک دشمن سرگرمیوں کے نام پر اِن صحافیوں کے خلاف مقدمات درج کرکے پولیس کی حراست میں انہیں شدید تشدد کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔

اس سب کے باوجود کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر یہ تحریک دس اگست کو ختم ہوگئی کہ یہ خالص عوامی تحریک تھی اور اس کے پس پشت اور کوئی قوت نہیں تھی۔

بنگلا دیش کی حالیہ طلبہ تحریک کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ یہ یکم جولائی ۲۰۲۴ء میں شروع ہوئی اور صرف ایک ماہ کے قلیل عرصے میں اپنا مقصد حاصل کرچکی تھی۔ کسی بھی انقلاب پسند کے لیے یہ عرصہ بڑا مسحور کن ہے۔ حقائق دیکھیں تو اس کے برعکس ہیں۔ دیکھنے میں طلبہ کا نعرہ کوٹہ سسٹم کا خاتمہ تھا تاہم اصل میں یہ حسینہ واجد کے خلاف ایک تحریک تھی۔ آخر میں حسینہ واجد نے کوٹہ سسٹم کے خاتمہ کی پیشکش کی تھی مگر احتجاجی رہنماؤں کا کہنا تھا کہ وہ حسینہ واجد کے حکومت کے خاتمے کے علاوہ اور کسی چیز پر رضامند نہیں ہوں گے۔

اس طرح سے دیکھا جائے تو حسینہ واجد حکومت کے خلاف مظاہرے یا احتجاجی مہم کوئی نئی چیز نہیں تھے۔ اس کا باقاعدہ آغاز ۲۰۲۲ء میں ہوا تھا جو کسی نہ کسی صورت تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ گو کہ ۱۰ر دسمبر ۲۰۲۲ء کو شروع ہونے والے متحدہ حزب اختلاف کی احتجاجی لہر میں اتنی شدت نہیں تھی کہ وہ ملک کو مفلوج کر کے رکھ دیتی تاہم یہ مظاہرے جاری رہے۔ مگر نومبر اور دسمبر ۲۰۲۳ء میں ہونے والے احتجاجی مظاہروں میں توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ کا پُر تشدد عنصر شامل ہو چکا تھا۔ شاید اس کی وجہ آئندہ جنوری ہونے والے انتخابات تھے جس کی وجہ سے حسینہ واجد مخالف عناصر نے اپنا پورا زور لگا ڈالا تھا۔ چونکہ حزب اختلاف کو انتخابات میں کامیابی کا یقین تھا اس لیے ہر اس کام سے گریز کیا گیا جس سے عام فرد کو تکلیف پہنچے اور ان کی مقبولیت میں کمی آئے اس لیے ان مظاہروں میں تشدد کا عنصر محدود تھا۔ ۷ جنوری ۲۰۲۴ء کو ہونے والے عام انتخابات میں حسینہ واجد انتظامی مشینری کا بھرپور استعمال کر کے اپنے آپ کو مسلسل چوتھی بار منتخب کروا چکی تھیں۔ اس سے حزب اختلاف کا صبر جواب دے گیا۔

حسینہ واجد مسلسل وزیر اعظم چلی آ رہی تھیں، بھارت میں مودی سے ان کے برادرانہ گہرے تعلقات تھے۔ علاقے میں تیزی سے رونما ہوتی تبدیلیوں کی بناء پر وہ چین کی بھی آنکھ کا تارا تھیں۔ عدلیہ پر بھی پورا قابو تھا کہ تمام جج صاحبان فیصلہ لکھنے سے قبل پوچھتے تھے کہ کیا لکھ دوں۔ انہیں صرف ایک ہی چیز سے خطرہ تھا اور وہ فوج تھی۔ اس کے لیے انہوں نے یہ پیش بندی کی تھی کہ سپہ سالار ایک ایسے شخص کو مقرر کیا تھا کہ نہ صرف اس سے بلکہ اس کی اہلیہ سے بھی ان کی قرابت داری تھی۔

رہ گئی حزب اختلاف تو اس کا علاج مودی ڈاکٹرائن کے مطابق کچل کر رکھ دینا تھا جس پر وہ ایک عشرے سے زاید عرصے سے کامیابی سے عمل پیرا تھیں۔ جماعت اسلامی کی چوٹی کی قیادت کو کٹھ پتلی عدلیہ کے ذریعے سولی چڑھا چکی تھیں۔ جماعت اسلامی کے کارکنان پابند سلاسل تھے۔ ان کی سب سے بڑی حریف خالدہ ضیاء بھی سلاخوں کے پیچھے زندگی کے دن گن رہی تھیں۔ اس طرح عوامی لیگ اور اس کے اتحادیوں کے علاوہ دیگر ساری جماعتوں کو دیوار سے لگا دیا گیا تھا۔ حزب مخالف کے لیے نہ جائے رفتن اور نہ پائے ماندن جیسی صورتحال تھی۔

حزب اختلاف کی ساری ہی پارٹیاں حسینہ واجد کو تخت و تاج سے بے دخل کرنے کے لیے کسی موقع کی تلاش میں تھیں۔ ایسے میں ضرورت سے زیادہ پر اعتماد حسینہ واجد کے جون ۲۰۲۴ء میں سرکاری ملازمتوں میں کوٹہ کی بحالی کے فیصلے نے انہیں یہ موقع فراہم کر دیا۔ بیروزگاری سے پریشان بنگلا دیشی طلبہ و نوجوان پہلے ہی روزگار کے کم مواقع کی دستیابی سے بیزار تھے کہ ۵ جون ۲۰۲۴ء کو بنگلا دیش کی ہائی کورٹ نے ۲۰۱۸ء کے عدالتی فیصلے کے خلاف حکومت کی اپیل پر فیصلہ کرتے ہوئے سرکاری ملازمتوں میں ہر قسم کا کوٹہ بحال کر دیا۔ یہ کٹھ پتلی عدلیہ کا ایسا کارنامہ تھا جس کے بعد حسینہ واجد کو مزید کسی دشمن کی ضرورت نہیں رہی۔ اس پر مزید تڑکا یہ لگا کہ سرکار کی ایماء پر اس فیصلے کے خلاف اپیل کو عدالت میں سماعت کے لیے مقرر ہی نہیں کیا جا رہا تھا۔

حسینہ واجد کے بطور وزیر اعظم پورے پانچ سال باقی تھے اور انہیں ہٹانے کا کوئی اور آئینی طریقہ موجود نہیں تھا۔ اس لیے اس موقع کو غنیمت جانا گیا اور پورے بنگلا دیش میں حزب اختلاف کی طلبہ تنظیمیں متحرک کر دی گئیں اور یوں طلبہ تحریک شروع ہو گئی۔ گو کہ حالات کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے حسینہ واجد نے ۱۹ر جولائی کو بذریعہ ہائی کورٹ ۵ جون کے فیصلے کو منسوخ کروا دیا تھا مگر اب پلوں کے نیچے سے پانی بہت بہہ چکا تھا اور بات حسینہ واجد کی بے دخلی پر آ گئی تھی۔

کہا گیا کہ احتجاجی طلبہ کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک غیر سیاسی طالب علم رہنما ناہید اسلام کا کردار اسکرپٹ میں شامل کیا گیا۔ مگر حقیقت حال سے واقف سارے ہی لوگ جانتے ہیں کہ اس احتجاج میں جماعت اسلامی اور خالدہ ضیاء کی نیشنلسٹ پارٹی کی طلبہ تنظیموں کا کردار کلیدی تھا۔ جماعت اسلامی کے کارکنان اس لیے زیادہ جذباتی تھے کہ ان کے رہنماؤں کو حسینہ واجد نے پھانسیاں دی تھیں، اب بھی کئی رہنما پھانسی گھاٹ میں موجود تھے جبکہ اس کے ہزاروں کارکنان قید و بند میں تھے۔

یہ تھا بنگلا دیش میں طلبہ تحریک کا اختصار کے ساتھ جائزہ۔ اس کو دیکھ کر یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ کیا یہ طلبہ تحریک کی شدت تھی کہ حسینہ واجد کو اس حال میں ملک چھوڑنا پڑا کہ ان کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا یا اس کامیابی میں کوئی اور عنصر بھی موجود تھا۔

جس وقت بنگلا دیش میں طلبہ تحریک عروج پر تھی اس زمانے میں بھارتی حکام سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے ماضی کی پالیسیوں کے برعکس اسے بنگلا دیش کا اندرونی معاملہ قرار دیا تھا۔ کیا سچ مچ یہ بنگلا دیش کا اندرونی معاملہ تھا، یا پھر اس میں بیرونی عناصر بھی ملوث تھے۔ یہ اہم ترین سوال ہے۔ بیرونی عناصر کے بارے میں گفتگو سے قبل اندرونی عناصر پر گفتگو کرتے ہیں۔

دیکھنے میں صف بندی دو پارٹیوں کے درمیان تھی۔ حسینہ واجد کی عوامی لیگ اور اس کی اتحادی جماعتیں اور خالدہ ضیاء کی نیشنلسٹ پارٹی اور جماعت اسلامی سمیت اس کی اتحادی جماعتیں۔ یہ تو سیاسی صف بندی تھی۔ پاکستان کی طرح بنگلا دیش میں بھی فوج کا اہم ترین کردار ہے اور جب بھی موقع ملا، فوج نے اقتدار پر قبضہ کرنے سے گریز نہیں کیا ہے۔ حسین محمد ارشاد کے مارشل لاء کے بعد بنگلا دیش کی فوج براہ راست اقتدار میں نہیں آ سکی ہے یا یوں کہیے کہ احساس محرومی کا شکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی موقع ملا بنگلا دیشی فوج کے سپہ سالار وقار الزماں نے حسینہ واجد سے قرابت داری اور ساتھ دینے کے قول و قرار کے باوجود اپنا سارا وزن خالدہ ضیاء کے پلڑے میں ڈال دیا کہ اس طرح اقتدار کو ترسی ہوئی فوج کو عبوری حکومت سے ہی کچھ حصہ مل جائے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ اگر فوج حزب اختلاف کا ساتھ نہ دیتی اور حسینہ واجد کو ضیاء الرحمٰن کے مارشل لاء کی یاد نہ دلاتی تو حسینہ واجد یوں جان بچا کر فرار نہ ہوتیں کہ جان ہے تو جہاں ہے۔ فوج نے pull n push دونوں کیا۔ ایک طرف تو ضیاء کے مارشل لاء کی تصویر کشی کرتے ہوئے بتایا کہ فوج میں اضطراب ہے اور اگر حسینہ واجد نے اقتدار نہ چھوڑا تو جونیئر افسران حملہ آور ہو کر ان کی تکہ بوٹی کر سکتے ہیں۔ اس طرح سپہ سالار صاحب کے ہاتھ سے معاملہ نکل جائے گا۔ دوسری جانب حسینہ واجد کو محفوظ راستہ دینے کی پیشکش کرتے ہوئے کہا گیا کہ فیصلہ کرنے کا وقت کم ہے۔ انہیں دباؤ میں لانے کے لیے مظاہرین کو ایوان وزیر اعظم کی جانب مارچ کرنے کے لیے فری ہینڈ دیا گیا۔ اس طرح سے مرضی کے مطابق انتقال اقتدار بھی ہو گیا اور بدنامی بھی نہ ہوئی بلکہ مفت میں قوم کے ہیرو بھی بن گئے۔

اب آتے ہیں بیرونی عناصر کی طرف۔ ممکنہ طور پر یہ بھارت ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ سے بنگلا دیش، نیپال اور بھوٹان وغیرہ کو سیٹلائٹ ریاستیں تصور کرتا ہے۔ مگر حسینہ واجد تو مودی جی کی کٹھ پتلی تھیں تو ان کے خلاف بھارت کوئی تحریک کیوں چلائے گا۔ اس طرح بھارت تو نہیں ہوا۔ تو پھر کیا یہ چین ہے۔ مگر چین کے ساتھ بھی حسینہ واجد اچھی equation میں

تھیں۔اس طرح سے بھارت کی طرح چین بھی اس معاملے میں نہیں ہے۔ بھارت نے اس ضمن میں پاکستان کا پرزور انداز میں نام لیا ہے اور کہا ہے کہ آئی ایس آئی اس پورے معاملے میں instrumental رہی۔ اپنے الزامات کو درست ثابت کرنے کے لیے انہوں نے سعودی عرب اور برطانیہ میں آئی ایس آئی کے افسران کی خالدہ ضیاء کے بیٹے طارق رحمٰن سے ملاقاتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ پاکستان اس وقت خود اپنے اندرونی مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ اپنے ہمسایہ ممالک سے اس کے تعلقات کشیدہ ہیں، چین سے بھی معاملات سرد مہری کی جانب جارہے ہیں۔ بلوچستان، خیبر پختونخوا اور گلگت بلتستان میں یہ دہشت گردی کا شکار ہے۔ ایسے میں یہ کسی اور ملک میں کارروائی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ رہی بات طارق رحمٰن سے ملاقاتوں کی تو، اس بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔ اس طرح پاکستان بھی بیرونی عناصر کی فہرست سے کٹ گیا۔ اب آخری نام امریکا کا بچتا ہے جس پر حسینہ واجد نے خود بھی الزام لگایا ہے۔ کیا یہ واقعی امریکا ہی ہے جس نے حسینہ واجد کا تخت اُلٹا ہے۔ اسے دیکھتے ہیں۔

یہ امریکا تو نہیں ہے مگر امریکا اور برطانیہ سے آپریٹ کی جانے والی تنظیمیں ضرور ہیں۔ جنہیں بین الاقوامی سازش کار استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات تو طے ہے کہ اس طرح کی تبدیلی حکومت میں اب بیرونی عناصر براہ راست مداخلت نہیں کرتے بلکہ ریموٹ کنٹرول کے ذریعے صورتحال کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اب دنیا میں مرضی کی حکومت کی تبدیلی لانے کے لیے باقاعدہ مینوئل ہے جسے colour revolution یا رنگین انقلاب کہا جاتا ہے۔ فروری ۲۰۱۸ء میں رنگین انقلابات کے عنوان سے پانچ آرٹیکلز پر مبنی ایک سیریز میں نے لکھی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ تبدیلی اقتدار کے لیے کس طرح بیرونی عناصر کام کرتے ہیں۔ اس سیریز میں بہار عرب سمیت دیگر ممالک میں تبدیلی حکمراں کا تجزیہ کیا گیا تھا۔

کیا شرق ہو کیا غرب، ہر جگہ حکمرانوں کی تبدیلی کے لیے نوجوانوں کو ہی استعمال کیا گیا۔ رنگین انقلابات میں ایک اور قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ اس میں بالکل ایک نئی قیادت سامنے لائی گئی۔ تو اس طرح ہمیں بنگلادیش میں بھی براہ راست بیرونی عناصر نظر نہیں آتے تاہم اگر وہ موجود ہیں تو ہم ان کی شناخت ضرور کرسکتے ہیں۔ رنگین انقلابات میں ایک بات اور اہم ہے کہ اس مینوئل کے ذریعے یا تو روس کے زیر اثر ممالک میں regime change یا حکومت کی تبدیلی لائی گئی یا پھر مسلم ممالک میں۔ یہ تبدیلی حکومت ایک طرح کا انقلاب ہی ہوتی ہے کہ تبدیلی کے ذریعے آنے والی حکومت گزشتہ حکومت کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ اس کی خارجہ پالیسی، داخلہ پالیسی یا معاشی پالیسی، گزشتہ حکومت کے مقابلے میں ۱۸۰ درجے کے زاویے پر ہوتی ہے۔

اب اس زاویے سے ہم طلبہ تحریک کا جائزہ لینا شروع کرتے ہیں کہ کیا یہ بھی رنگین انقلاب تھا۔ بنگلادیش کی طلبہ تحریک کا بغور جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ رنگین انقلاب کے مینول کے عین مطابق ہے۔ بس فرق صرف اتنا سا ہے کہ اس میں کوئی مخصوص رنگ استعمال نہیں کیا گیا البتہ انقلابیوں نے شناخت کے لیے ماتھے پر بنگلا دیشی پرچم ضرور باندھا۔ اس میں بھی ایک انقلابی نعرہ ''میں کون، تو کون۔ رضا کار رضا کار'' coin کیا گیا۔ اس میں بھی پرانے سیاسی کارکنان کی جگہ طلبہ کو استعمال کیا گیا۔ چوبیس پچیس سالہ نئی لیڈر شپ بنائی گئی، جس کا پہلے کہیں تذکرہ بھی نہیں تھا۔ پرانے سیاست دانوں یا پارٹیوں کی جگہ نئے tools استعمال کیے گئے، جس میں این جی اوز المعروف سول سوسائٹی اور سوشل میڈیا سرفہرست ہیں۔ دیگر رنگین انقلابات کی طرح انقلابیوں میں دائیں اور بائیں کی کوئی تخصیص نہیں تھی اور وہ باہم شیر وشکر تھے۔

یہ جاننے کے بعد کہ بنگلادیش بھی رنگین انقلاب کی سازش کا شکار ہوا ہے، ہمارے لیے معاملات کو سمجھنا بہت آسان ہوجاتا ہے۔ ہم جان سکتے ہیں کہ تحریک کے فنانسر کون ہیں، اور سب سے بڑھ کر وہ چاہتے کیا ہیں۔

میں یہ بات بارہا لکھ چکا ہوں کہ نیو ورلڈ آرڈر کے سازش کاروں نے اپنے سارے کام تقسیم کر رکھے ہیں اور کوئی کسی دوسرے کے کام میں مداخلت نہیں کرتا۔ جیسا کہ دنیا بھر میں نئی بیماریوں کا پھیلاؤ، انہیں وبائی صورت دینا اور دنیا بھر میں زبردستی ویکسین لگا کر طویل مدتی اہداف کا حصول (کل ہی اقوام متحدہ نے غزہ میں سات روزہ جنگ بندی کی اپیل کی ہے کہ وہاں پر پولیو ویکسین لگائی جاسکے۔ غور کیجیے، اقوام متحدہ کو معصوم بچوں کے مارے جانے کی کوئی فکر نہیں ہے مگر پولیو ویکسین کی فکر ضرور ہے)، یہ سب ملنڈا اینڈ بل گیٹس فاؤنڈیشن کا کام ہے۔ بل گیٹس اور ملنڈا میں طلاق ہوگئی مگر فاؤنڈیشن اسی طرح intact ہے اور وہ دونوں بھی اس میں اتنے ہی دلچسپی سے کام کررہے ہیں کہ اوپر سے حکم یہی ہے۔ باقی سارے ادارے اور افراد ان کی ہر طرح سے ضرورت کے مطابق مدد ضرور کرتے ہیں مگر اس کام میں مداخلت کے مجاز نہیں ہیں۔ اسی طرح دنیا بھر میں رنگین انقلاب لانے کی ذمہ داری جارج سوروز کی این جی او Open Society Foundation یا OSF کے سپرد ہے۔

حسینہ واجد کے ایوان وزیراعظم چھوڑتے ہی اگلے لمحے طلبہ کی قیادت نے مطالبہ کیا کہ عبوری حکومت کا سربراہ گرامین بینک کے بانی اور نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر محمد یونس کو بنایا جائے۔ یہ عجیب سی بات تھی کہ ابھی حسینہ واجد ٹھیک طرح سے رخصت بھی نہیں ہوئی تھیں کہ عبوری حکومت کے سربراہ کا نام احتجاجی طلبہ کی جانب سے نہ صرف سامنے آگیا بلکہ فوری طور پر قبول بھی کرلیا گیا۔

سب سے پہلے ڈاکٹر محمد یونس کا پروفائل دیکھتے ہیں۔ اس سے معاملات سمجھنے میں آسانی رہے گی۔ ڈاکٹر محمد یونس چٹاگانگ کے علاقے ہتھ ہزاری کے ایک گاؤں میں ۲۸ جون ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے۔ اس طرح ان کی عمر ۸۴ برس ہوچکی ہے۔ ۱۴ بہن بھائیوں میں ان کا نمبر تیسرا ہے۔ اعلیٰ تعلیم ڈھاکا یونیورسٹی، Colorado یونیورسٹی، Boulder یونیورسٹی اور وانڈربلٹ یونیورسٹی سے حاصل کی۔

ایک روسی خاتون Vera Forostenko سے انہوں نے ۱۹۷۰ء میں شادی کی بعد ازاں یہ شادی طلاق پر ۱۹۷۹ء میں ختم ہوگئی۔ Vera سے ان کی بڑی بیٹی مونیکا ہے جو امریکی شہریت کی حامل ہے اور وہیں پر وہ مختلف اوپرا کمپنیوں کے لیے بطور مغنیہ پرفارم کرتی ہے۔ بعدازاں انہوں نے ۱۹۸۳ء میں جہانگیر نگر یونیورسٹی ڈھاکا کی فزکس کی پروفیسر افروزی سے شادی کی جس سے ان کی ایک اور بیٹی دینا ہے۔

یوں تو ڈاکٹر یونس کو آغا خان اور گاندھی پرائز سمیت درجنوں اعزازات و انعامات دیے گئے مگر قابل ذکر نوبل انعام اور دیگر دو امریکی انعامات ہیں۔ انہیں ۲۰۰۶ء میں نوبل پرائز ملا جبکہ ۲۰۰۹ء میں US Presidential Medal of Freedom اور ۲۰۱۰ء میں Congressional Gold Medal دیا گیا۔ اب تک دنیا میں صرف سات افراد ایسے ہیں جو یہ تینوں پرائز رکھنے یا گرینڈ سلام کا اعزاز رکھتے ہیں اور ڈاکٹر یونس ان میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر یونس پر ان سب انعامات اور اعزازات کی بارش گرامین بینک کے قیام کے بعد سے ہوئی۔ ''گرامین'' بنگالی زبان میں ''دیہاتی'' کو کہتے ہیں۔ یوں ہم اسے اردو میں دیہاتی بینک یا زیادہ بہتر الفاظ میں کسان بینک کہہ سکتے ہیں۔ آخر یہ گرامین بینک تھا کیا، جس پر پوری دنیا میں ان کی

واہ واہ ہوئی۔ ڈاکٹر یونس نے انتہائی غربت میں پھنسے ہوئے افراد کو قرض دینے کی اسکیم شروع کی۔ نہیں نہیں، ایسا نہیں تھا کہ وہ ان کی امداد کر رہے تھے بلکہ انہوں نے ان غریب افراد کو انتہائی مہنگی شرح سود پر قرض دیا۔ یوں سمجھیں کہ یہ ہندو بنیے کی ایک شکل تھی جو گاؤں گاؤں منظم طریقے سے پھیلا دی گئی۔

میرے ایک دوست تھے سہیل صدیقی۔ وہ پی آئی اے کے سپلائرز میں سے ایک تھے۔ انتہائی زیرک اور دانشور۔ سہیل صدیقی کا کہنا تھا کہ جب کوئی شخص بینک سے قرض لے لیتا ہے تو اس دن سے وہ اپنے لیے نہیں کماتا بلکہ بینک کے لیے کماتا ہے۔ یوں محمد یونس نے دیکھتے ہی دیکھتے کروڑوں انتہائی غریب دیہاتی افراد کو بینک کے لیے کمانے پر مامور کر دیا۔ مائیکرو کریڈٹ کو پوری دنیا میں غریبوں کے لیے موت کے پھندے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں قرض خواہ سے ہفتہ واری وصولی کی جاتی ہے اور سود کی شرح انتہائی بلند ہوتی ہے جو عمومی طور پر ۱۵ فیصد سے ۴۰ فیصد کے درمیان ہوتی ہے۔

یہ ایسا کارنامہ تھا جو دنیا پر قابض بین الاقوامی بینکاروں کے لیے انوکھا تھا کہ کوئی ان افراد سے بھی پیسے نکلوا سکتا ہے جن کے پاس اپنے کھانے کے لیے پیسے نہ ہوں۔ ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ محمد یونس کی اس کمال فنکاری پر اش اش کر اٹھے۔ یوں ڈاکٹر محمد یونس کو اچانک سے بین الاقوامی بینکاروں میں پذیرائی حاصل ہوگئی اور ان پر انعامات و اعزازات کی بارش کر دی گئی۔ پوری دنیا میں ان کی image building کی گئی اور انہیں غریبوں کے مسیحا کے طور پر پیش کیا گیا۔

موجودہ صدی کے آغاز سے ہی نہ صرف ڈاکٹر محمد یونس بین الاقوامی بینکاروں کے راڈار پر تھے بلکہ ان کے رابطے میں بھی۔ اب وہ ان کے چہیتے اور پسندیدہ بن چکے تھے اور ان کے رنگ میں رنگے بھی جا چکے تھے۔ اس طرح اب وہ ان کی ہدایت کے مطابق اور معاونت سے روز ایک نیا ادارہ بنا رہے تھے، غریبوں کو قرض کے پھندے میں پھنسانے کے لیے بینک میں روز ایک نئی اسکیم متعارف کروا رہے تھے اور ان بین الاقوامی بینکاروں کی جڑیں مضبوط بنانے میں معاون ثابت ہو رہے تھے۔

اب ڈاکٹر یونس کی خواہشات بڑھ رہی تھیں اور وہ بین الاقوامی بینکاروں کی ہدایت کے مطابق حکومت میں بھی دخیل ہونے لگے تھے۔ ۲۰۰۶ء کے شروع میں انہوں نے ناگورک شکتی کے نام سے ایک سیاسی پارٹی بنانے عزم کا اعلان کیا۔ ناگورک بنگالی زبان میں شہریوں کو اور شکتی طاقت کو کہتے ہیں۔ اسے اردو میں ہم عوامی طاقت کا نام دے سکتے ہیں۔ گو کہ پارٹی کا عزم دیہاتوں میں انتہائی نچلی سطح پر کام کرنا تھا یعنی ہر ۲۰ دیہاتی خاندان پر پارٹی کا ایک یونٹ تجویز کیا گیا تھا مگر یہ ایک طرح کی اشرافیہ کی پارٹی تھی جس کے بانیوں میں ڈاکٹر یونس کے علاوہ سول سوسائٹی کے پروفیسر رحمن سبحان، سابق چیف جسٹس محمد حبیب الرحمن، جیورسٹ کمال حسین، پروتھوم آلو، اسٹار کے ایڈیٹر مطیع الرحمن، ایڈیٹر محفوظ النعم اور معیشت داں دیبا پریا بھٹا چاریہ شامل تھے۔ ۱۸ فروری ۲۰۰۷ء میں پارٹی کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا اور یوں ڈاکٹر یونس کے سیاسی سفر کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ گاہے بگاہے ڈاکٹر یونس نے ملک کے سربراہ بننے کی خواہش کا اظہار کیا مگر وہ ناکام رہے۔ ۲۰۱۳ء میں بھی ڈاکٹر یونس نے وزیراعظم بننے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ ڈاکٹر یونس کی یہ سیاسی خواہشات و عزائم حسینہ واجد کو کھٹک رہے تھے۔ ڈاکٹر یونس کے ایوان وزیراعظم میں داخلے کا واضح مطلب حسینہ واجد کی رخصتی تھی جو حسینہ کو کسی بھی صورت منظور نہیں تھی۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ عالمی سازش کاروں کا ہر کام انتہائی مربوط ہے۔ ہر پروجیکٹ کے لیے وہ ایک فوکل پرسن مقرر کرتے ہیں جو مذکورہ پروجیکٹ کا ذمہ دار ہوتا ہے جیسا کہ بل گیٹس ویکسینیشن کے لیے یا جارج سوروز دنیا بھر میں ناپسندیدہ مقتدر افراد کی تبدیلی کے لیے۔ اسی طرح ڈاکٹر یونس سے رابطے اور ان سے کام لینے کے لیے ہلیری کلنٹن کا بطور فوکل پرسن تقرر کیا گیا۔ جب بھی ڈاکٹر یونس پر کوئی برا وقت آیا، ہلیری کلنٹن دامے، درمے، سخنے ان کی مدد کے لیے موجود تھیں۔ انہوں نے ڈھاکا کو ہر مرتبہ واضح الفاظ میں پیغام بھیجا کہ وہ ڈاکٹر یونس کے کام میں مداخلت نہ کریں بصورت دیگر نتائج کے لیے تیار رہیں۔ اس کے لیے انہوں نے بین الاقوامی سازش کاروں کے نیٹ ورک کا بھرپور استعمال کیا۔

ڈاکٹر یونس کے پروفائل کا مختصر جائزہ لینے کے بعد ہم جان گئے ہیں کہ عالمی سازش کاروں کا ڈھاکا میں گھوڑا کون سا ہے۔ اب معاملات سمجھنے آسان ہوگئے ہیں کہ کس طرح سے بنگلا دیش میں رنگین انقلاب کے لیے بھرپور مالی معاونت فراہم کی گئی۔ گو کہ بنگلا دیش میں رنگین انقلاب کے حوالے سے بہت سارے سوالات کے جواب مل گئے ہیں مگر اب بھی دو اہم سوالات باقی ہیں کہ عالمی سازش کار اس رنگین انقلاب سے چاہتے کیا ہیں اور کیا بنگلا دیش میں آنے والا یہ رنگین انقلاب محض ڈھاکا تک محدود رہے گا یا بہار عرب کی طرح اس کا پھیلاؤ خطہ میں مزید ہوگا۔ اگر اس کا پھیلاؤ ہوا تو کیا پاکستان بھی اس میں شامل ہوگا۔

شیخ حسینہ واجد کہیں سے بھی اسلامی فکر و ذہن کی حامل نہیں تھیں بلکہ انہیں اسلام اور اسلام کے ماننے والوں سے شدید بغض تھا بلکہ یہ کہا جائے کہ اسلام کے خلاف ان کی جو خدمات ہیں وہ کسی بھی غیر مسلم سے کہیں زیادہ ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ روہنگیا مسلمانوں کے ساتھ انہوں نے جو کچھ کیا، وہ کرنے کا تو غیر مسلم بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ خود بنگلا دیش کے مسلمان شہریوں کو جس طرح سے انہوں نے محض اس پاداش میں سولی پر چڑھایا یا پھر جیلوں میں بند کیا کہ وہ اسلام کے نام لیوا تھے، اس کی مثال بھارت اور اسرائیل کے علاوہ کہیں اور سے ملنا مشکل ہی ہے۔ اس لیے یہ سوچنا کہ حسینہ واجد کو اس لیے ہٹایا گیا کہ وہ ایک مسلم ملک کی حکمراں تھیں یا اسلام کا پھیلاؤ چاہتی تھیں، احمقانہ بات ہے۔

تو پھر شیخ حسینہ واجد کو ہٹانے کی کیا وجہ تھی؟ کیا اس کی وجہ وہی تھی جو حسینہ واجد بیان کرتی رہی ہیں کہ امریکا بنگلا دیش کے عیسائی اکثریتی قبائلی علاقے کو الگ کر کے ایک علیحدہ ریاست بنانے کا خواہاں ہے اور بنگلا دیش کے ایک جزیرے پر اپنا فوجی مستقر بنانا چاہتا ہے کہ علاقے پر سے چینی اثر و نفوذ کو زائل کر سکے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکا کو بنگلا دیش میں ایک امریکی اڈے کی ضرورت کیوں ہے۔ بنگلا دیش کے عین مقابل بحر ہند میں دنیا میں امریکا کا سب سے بڑا امریکی فوجی اڈہ ڈیگو گارشیا موجود ہے۔ امریکا کو بحر ہند کے بحری ٹریفک کو کنٹرول کرنا ہے تو اس کے لیے ڈیگو گارشیا ہر لحاظ سے بہترین ہے۔ اس کے لیے خلیج بنگال کے دور افتادہ کونے میں سیکڑوں ارب ڈالر خرچ کر کے چین سے مزید مخاصمت کیوں مول لی جائے۔ اگر خطہ میں چینی اثر و نفوذ کا خاتمہ ہی مقصود ہے تو زیادہ بہترین بھارت کے منی پور، میزورام اور ناگالینڈ کے علاقے ہیں جہاں پہلے سے ہی علیحدگی کی تحاریک زوروں پر ہیں اور یہ علاقے چین کے بھی زیادہ نزدیک ہیں اور خلیج بنگال کے کونے پر نہیں بلکہ درمیان میں ہیں جہاں سے بحر ہند زیادہ نزدیک ہے۔ اگر بھارت کے ان سرحدی علاقوں میں امریکی چوکیاں یا اڈے قائم ہو جائیں تو یہ چین، بھارت، بنگلا

دیش، سری لنکا سب کے سر پر بیٹھا ہوگا۔ اس طرح یہ بات محل نظر ہے کہ امریکا بنگلا دیش کے سرحدی علاقے کو الگ کر کے وہاں پر اپنا فوجی مستقر بنانا چاہتا ہے۔

تو پھر حسینہ واجد کا ایسا کیا قصور تھا کہ انہیں ہٹانے کے لیے باقاعدہ ایک تحریک برپا کی گئی اور وہاں پر رنگین انقلاب لایا گیا۔ ہر چیز کی ایک شیلف لائف ہوتی ہے۔ حسینہ واجد سب کچھ بہترین کر رہی تھیں مگر ان کی شیلف لائف پوری ہو چکی تھی۔ ان کے اقدامات کے خلاف عوام میں غم اور غصہ اپنی انتہا پر پہنچ چکا تھا۔ ایسے میں کوئی بھی چنگاری انہیں جلا کر خاکستر کر سکتی تھی۔ اس لیے بجائے اس کے کہ انہیں کوئی اور طاقت ہٹا کر اپنا مہرہ لائے، بہتر ہے کہ خود ہی تبدیل کر کے روبوٹ کا نیا ماڈل لایا جائے۔ حسینہ واجد کو ہٹانا ایسا ہی ہے جیسے کھیل کے دوران اچانک کسی ٹیم کا کوچ سات نمبر کھلاڑی کو میدان سے باہر بلا کر پندرہ نمبر کھلاڑی کو میدان میں اتار دے۔ جس طریقے سے حسینہ واجد کو ہٹایا گیا، اگر یہ طریق کار اختیار نہ کیا جاتا اور پرامن انتقال اقتدار ہو جاتا تو عوام کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ اب بنگلا دیشی عوام اگلے سات آٹھ برس تک کچھ نہیں بولیں گے اور عالمی استعمار کے ایجنٹ ان کے ساتھ وہ ہاتھ کر جائیں گے جو مطلوب ہے۔

میں نے گزشتہ سطروں میں ایک دوست سہیل صدیقی کا تذکرہ کیا تھا۔ جب شوکت عزیز پاکستان لائے گئے تھے، اس وقت سہیل صدیقی نے کہا تھا کہ جب کسی ادارے کی liquidation مقصود ہوتی ہے تو اس ادارے کی سربراہی بینکار کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اب پاکستان ایک بینکار شوکت عزیز کے سپرد کر دیا گیا ہے، اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔ شوکت عزیز کہیں سے بھی مشرف کی ٹیم میں شامل نہیں تھے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ فوجیوں کے علاوہ اور کوئی بھی مشرف کی ٹیم میں شامل نہیں تھا۔ شوکت عزیز کی طرح کے افراد بین الاقوامی بینکاروں نے چھاتے کے ذریعے پاکستان میں اتارے تھے اور وہ اپنا مشن بخوبی مکمل کر کے چلے گئے۔ اسی طرح ایک بینکار کا بنگلا دیش میں تقرر اس امر کی طرف نشاندہی کر رہا ہے کہ پاکستان کی طرح اب بنگلا دیش کی بھی liquidation کا عمل شروع کر دیا گیا ہے۔

اب عالمی بینک اور آئی ایم ایف کی ہدایات کے عین مطابق آئندہ چند برسوں میں بنگلا دیش کی معیشت کا وہی حال ہونے والا ہے جو پاکستان کا کر دیا گیا ہے۔ جوں جوں وقت گزر رہا ہے، ہم ایک عالمی حکومت کے قیام کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ ایک عالمی حکومت کے قیام کے بلیو پرنٹ کے مطابق اس کے لیے دنیا بھر کے ممالک کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرنا اور پھر انہیں دس نئے انتظامی یونٹوں کے زیر انتظام لانا شامل ہے۔ بنگلا دیش میں ابھی نیا نیا انقلاب آیا ہے۔ لوگ فتح کی خوشی میں رقص و بے خودی کے عالم میں ہیں۔ جتنے بھی اہم فیصلے کرنے ہیں، یہ عبوری حکومت تیزی سے وہ تمام اقدامات کر گزرے گی۔ بعد میں ان پر عملدرآمد ہوتا رہے گا۔

اب آخری اور اہم سوال بچتا ہے کہ کیا ڈھاکا میں آنے والا رنگین انقلاب دہلی اور اسلام آباد کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔

دہلی اور اسلام آباد، دونوں حکومتیں نہ صرف متفکر ہیں بلکہ انہوں نے پیش بندی کے لیے اقدامات بھی شروع کر دیے ہیں۔ رنگین انقلابات کی toolkit سے واقف دونوں حکومتیں اس وقت صورتحال کا بغور جائزہ لے رہی ہیں۔ مثال کے طور پر انہیں معلوم ہے کہ رنگین انقلاب کے لیے ہمیشہ سے نوجوان قیادت سامنے لائی جاتی ہے جس کا پہلے سے کوئی سیاسی پس منظر نہیں ہوتا۔ مذکورہ ملک کے عوام اور دنیا کو بتانے کے لیے عوامی مسائل کا سہارا لیا جاتا ہے۔ کسی بھی اچانک حادثے سے احتجاج شروع ہوتا ہے اور پھر معاملہ حکومت کی تبدیلی پر منتج ہوتا ہے۔ اس پورے معاملے میں سول سوسائٹی، دایاں بازو، بایاں بازو، حزب اختلاف کی تمام جماعتیں، اسٹیبلشمنٹ سب ایک پیج پر ہوتے ہیں۔ جھوٹی سچی کہانیوں کے پھیلاؤ اور عوامی جذبات کو ابھارنے کے لیے سوشل میڈیا اہم ترین کردار ادا کرتا ہے جس کے لیے انٹرنیٹ اہم ترین ہے۔

پاکستان اور بھارت کے شدید خوف کا اندازہ ہم حال میں کیے جانے والے سرکاری اقدامات سے کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان میں انٹرنیٹ کی سست ترین رفتار بلکہ بعض اوقات بند ہی ہونا اور سوشل میڈیا ایپس کا ڈاؤن لوڈ نہ ہونا۔ ۱۰/اگست ۲۰۲۴ء کو پاکستان کی وزارت داخلہ نے ایک پریس ریلیز جاری کیا جس میں کہا گیا کہ حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ ایسے تمام شر پسند عناصر جو نوجوان طلبہ کو احتجاج کے لیے ابھارنے کی کوشش کریں گے، کے نام فورتھ شیڈول میں ڈال دیے جائیں گے۔ اسی پریس ریلیز میں یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ فورتھ شیڈول میں نام ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں بلا اجازت شہر چھوڑنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور ان کے قومی شناختی کارڈ و پاسپورٹ منسوخ کر دیے جائیں گے اور انہیں کیریکٹر سرٹیفکٹ جاری نہیں کیے جائیں گے۔ اس پریس ریلیز پر غور فرمائیے کہ حکومت پاکستان کو اچانک ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پڑی اور اس میں عوام کو احتجاج پر ابھارنے کے بجائے نوجوان طلبہ کو احتجاج پر ابھارنے کی اصطلاح کیوں استعمال کی گئی۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ رنگین انقلاب کی toolkit میں یہ شامل ہے کہ کسی بھی حادثے سے احتجاج شروع ہوتا ہے اور پھر اس میں سرکار میں شامل بین الاقوامی سازش کاروں کے ایجنٹ (دیکھنے میں حماقت آمیز) اقدامات کے ذریعے جلتی پر تیل کا کام کرتے ہیں۔ یوں احتجاج کا دائرہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بتدریج اس میں تشدد کا عنصر بھی شامل کیا جاتا ہے اور پھر آخری مطالبہ حکومت کی تبدیلی ہوتا ہے۔ بھارت میں کلکتہ میں ایک خاتون ڈاکٹر کو جنسی زیادتی کے بعد شدید تشدد کے بعد قتل کے نتیجے میں ہونے والے احتجاج پر اس زاویے سے نگاہ تو ڈالیے کہ صورتحال کس تیزی سے اس جانب بڑھتی نظر آ رہی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ بھارت میں رنگین انقلاب کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ بنگلا دیش میں بھی ۲۰۱۸ء میں Road Safety Movement شروع کی گئی تھی جو ملک گیر احتجاج میں تبدیل ہونے کے باوجود ختم ہو گئی تھی۔ مگر ڈھاکا میں رنگین انقلاب کے بعد دہلی لرزہ براندام ہے کہ کہیں نوجوان ڈاکٹروں کا احتجاج رنگین انقلاب میں تبدیل نہ ہو جائے۔

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ نئی کتاب

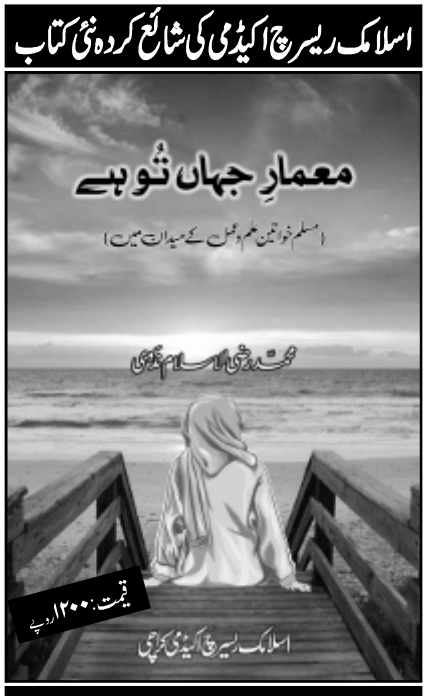

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36368020

ویسے بھی مودی اور حسینہ واجد میں بہت مماثلت ہے۔ دونوں کو اقتدار میں آئے طویل عرصہ ہوگیا۔ دونوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ دونوں نے حزب اختلاف کو دیوار سے لگایا اور کچل کر رکھ دیا، دونوں حکمرانی کے نشے میں کسی کو خاطر میں نہیں لائے۔ اگلا ایک ہفتہ بتانے کے لیے کافی ہوگا کہ بھارت کس راستے پر ہے۔

رہا پاکستان تو یہاں پر رنگین انقلاب کا خطرہ اس لیے نہیں ہے کہ یہاں پر عوام ناامید ہو چکے ہیں۔ انہیں نہ تو کسی سیاستداں پر اب اعتماد رہا ہے اور نہ ہی عدلیہ پر۔ بنگلا دیش میں فوج ایک ایسی قوت تھی جو ایک بڑے عرصے سے اقتدار میں نہیں تھی اس لیے اس کے سارے پاپ بھول کے اشنان میں دھل چکے تھے۔ پاکستان میں تو شکایت ہی عوام کو فوج سے ہے۔ تو اب حکومت تبدیل ہوگی تو اس کی جگہ کس کو لایا جائے گا۔ دور دور تک کوئی نہیں ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ اس کے لیے تیکنیکی ماہرین پر مشتمل ٹیم لائی جائے گی مگر اس کے تجربے بھی پاکستان کئی مرتبہ دیکھ چکا ہے اور اس کے نتائج بھی۔ یوں پاکستان اب رنگین انقلاب سے بہت آگے بڑھ چکا ہے اور تقسیم در تقسیم کے راستے پر تیزی کے ساتھ رواں دواں ہے۔

بھارت اور پاکستان میں سرکار شدید خوف میں مبتلا ہے۔ نادیدہ دشمن کے سائے سے بھی ڈرنا، جسے بھی دشمن سمجھا جائے اسے کچل دینے کی پالیسی پر عمل ایسے عوامل ہیں جو ان کی بوکھلاہٹ کو بھی ظاہر کر رہے ہیں اور اس عمل کو انگیز بھی کر رہے ہیں۔ اگر رنگین انقلاب کو یا تقسیم کے عمل کو روکنا ہے تو عوام دوست بننا ہوگا۔ مگر راج کے سنگھاسن پر بیٹھے افراد کے لیے یہ سب سے مشکل کام ہے۔ وہ اس کا مصنوعی مظاہرہ تو چند لمحوں کے لیے کر سکتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں کر سکتے۔

●●●

جب تاج اُچھالے جاتے ہیں

عفت حسن رضوی

گزشتہ ماہ عراق کے ایک طویل سفر کے دوران سابق آمر صدام حسین کے محل جانا ہوا، بلکہ محل نہیں کھنڈر کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

صدام حکومت گرنے کے بعد دل جلوں نے محلات میں سجے نشاط وعیش کے سامان پہ تو ہاتھ صاف کیا ہی، بعض لٹیروں نے حد کر دی کہ ان محلات میں لگے بجلی کے تار تک نوچ لیے۔

جب سلطنتیں گرتی ہیں تو محل کے مرکزی دروازے لٹیروں، چور اچکوں، عوام وخواص سب کے لیے کھل جاتے ہیں اور محلات کے چور دروازوں سے حکمران اپنی جان بچا کر بھاگتے نظر آتے ہیں۔ ایسا ہی بنگلا دیش کی سابق وزیر اعظم شیخ حسینہ کے ساتھ ہوا۔

بین الاقوامی نشریاتی اداروں کی رپورٹس بتا رہی ہیں کہ مظاہرین نے شیخ حسینہ کے محل کا محاصرہ کیا ہوا تھا اور وہ محل کے بند دروازے توڑنے کے اتنے قریب تھے کہ شیخ حسینہ کو بھاگنے کے لیے صرف کچھ منٹ کا وقت مل سکا۔

جس گاڑی میں شیخ حسینہ کو لے جایا جانا تھا، وہ گاڑی محل کے دروازے سے واپس لوٹ آئی کیونکہ مشتعل مظاہرین حکمرانوں کی بوٹیاں تک نوچنے کے لیے تیار تھے۔

بنگلا دیش واحد ملک نہیں جہاں حکومت گرتے ہی لوگوں نے اشرافیہ کے محلات پر دھاوا بولا۔ حال ہی میں ہم نے سری لنکا، عراق اور افغانستان وغیرہ میں حکومت گرتے اور لُٹتے دیکھی ہے۔

اور خیر ہو موبائل فون کے کیمروں کی کہ ہم یہ مناظر لائیو دیکھ رہے ہیں۔ اسے ہم سب کے دل میں چھپے غم و غصے کا کتھارسز کہہ سکتے ہیں کہ محلات کی لوٹ مار کی ویڈیوز کسی ایکشن فلم کے ہیروز کو دیکھنے جیسی لگتی ہیں جہاں ہیرو ولن کو مار مار کے بھرکس نکال دیتا ہے اور شائقین سیٹیاں بجاتے ہیں۔

شیخ حسینہ کے گھر کی کرسیاں، بستر، فریج، ٹی وی مظاہرین نے سب کچھ سمیٹا۔ بنگالی مظاہرین بکریاں بطخیں، مرغیاں اپنی بغلوں میں دبائے محل سے نکلتے نظر آئے۔

یہاں تک کہ الماریوں میں سجی بیش قیمت ساڑھیاں اور زیر جامے تک اٹھا لیے گئے۔ سوشل میڈیا پہ درجنوں ویڈیوز موجود ہیں۔

یہ مظاہرین اپنی جیت پہ تو خوش ہیں ہی لیکن مالِ غنیمت لوٹ لینے کی خوشی ان کے چہروں پہ دیدنی ہے۔

مظاہرین یقیناً کئی ہفتوں سے ڈھاکا کی پولیس سے آنکھ مچولی کرتے کرتے تھک گئے ہوں گے، اسی لیے شیخ حسینہ کے کچن میں پکی مچھلی اور بریانی کے تھال تک چٹ کر گئے۔

مشہور مقولہ ہے کہ مالِ مفت دلِ بے رحم، اوپر سے وہ مفت مال اگر آمر و ظالم حکمران کا ہو تو دل کچھ اور بھی بے رحم ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی گزشتہ کچھ برسوں میں ہم نے عراق، سری لنکا، افغانستان اور اب بنگلا دیش میں دیکھ لیا۔

سری لنکا کے سابق صدر راجا پاکسا کے محل میں شفاف پانی کا سوئمنگ پول سب سے یادگار رہا جہاں مظاہرین نے ڈبکیاں مار مار کر معزول راجا پاکسا کے خلاف اپنے غصے کا اظہار کیا۔ لوگوں کے حافظے میں کولمبو کے محل کا وہ منظر بھی ابھی تازہ ہوگا جہاں تین سری لنکن مظاہرین بستر پہ لیٹے ہیں اور شانِ بے نیازی سے اپنے موبائل فون میں مصروف ہیں۔ یہ راجا پاکسا کا بیڈ روم تھا۔

اس سے قبل افغانستان میں سابق صدر اشرف غنی کے صدارتی محل میں طالبان کی انٹری تو یاد ہوگی، جب اشرف غنی کی ٹیبل پہ مسلح طالبان نے بیٹھ کر سیلفیاں لی تھیں۔

۲۰۱۱ء میں لیبیا کے مرکز تریپولی میں معمر قذافی کے محل پہ بمباری ہوئی، قذافی تو غائب ہو گئے لیکن پھر محل کو عوام نے نہیں چھوڑا۔

محل کے حمام، مہمان خانے، کچن ہر کونے کو عوام نے ٹھونک بجا کر چیک کیا، استعمال کیا اور سامان ساتھ لے گئے۔ قذافی کے محل میں البتہ فرار ہونے کا انتظام بڑے تام جھام سے کیا گیا تھا۔

جمہور جب اپنے اپنے مسئلوں میں گھرے ہوں تو گویا سناٹے میں بیٹھے ہوتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جمہور اندھے ہیں کہ انہیں اشرافیہ کی شان و شوکت نظر نہیں آ رہی، دیکھ سب رہے ہیں لیکن لوہار کا بس ایک دن کافی ہوتا ہے۔

ڈھاکا کے محل کے نصیب میں بھی ویسے ہی اجڑنا لکھا تھا جیسے تریپولی، بغداد، کابل اور کولمبو کے محلات اجڑ گئے۔

ان محلات کے در و دیوار شاہد ہیں کہ کیسے یہاں تخت نشین حکمران طاقت کے نشے میں چُور رہا کرتے تھے۔ کیسے بھوکی جمہور کو سوکھی روٹی کے مشورے دینے والی اشرافیہ پیرس کی بیش قیمت برانڈز سے کم پہ راضی نہیں ہوتی تھی۔

آج تاج اچھالے جا رہے ہیں، سب کی باری آ رہی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکمرانوں کے پاؤں تلے زمین کیسے کھسکتی ہے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکمرانوں کے کم خواب کے بستروں پہ جوتوں سمیت لیٹ کر مظاہرین نجانے کتنے جنموں کی تھکن اُتار رہے ہیں۔ ہم تو دیکھ رہے ہیں لیکن ہماری اشرافیہ کے محلوں کے مکین، نجانے وہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ نہیں؟

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۹ راگست ۲۰۲۴ء)

کلاس روم میں مصنوعی ذہانت

بل گیٹس

امریکا میں نیو آرک کے مقام پر فرسٹ ایونیو الیمینٹری اسکول نے کلاس روم میں مصنوعی ذہانت کے ٹولز کے ذریعے تعلیم دینے میں پہل کی ہے۔

جب میں بچہ تھا تب میرے والدین مجھے سیٹل میں منعقدہ عالمی میلے میں لے گئے تھے۔ وہاں ٹیکنالوجی کے شاہکار دیکھ کر حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ سب کچھ سائنس فکشن کی کہانیوں میں پائے جانے والے ماحول جیسا لگ رہا تھا۔ یہ میلہ ۶ ماہ تک لگا رہا اور میں نے والدین سے کئی بار فرمائش کی کہ مجھے میلے میں لے جاتے رہیں اور میں کئی بار گیا تاہم جب بھی وہاں سے نکلتا تھا تب ایسا لگتا تھا جیسے مستقبل کی بس ایک معمولی سی جھلک دیکھ پایا ہوں۔

بالکل ویسا ہی احساس مجھے حال ہی میں اُس وقت ہوا جب میں نیو آرک، نیو جرسی کے ایک کلاس روم سے باہر آیا۔

مئی میں مجھے فرسٹ ایونیو الیمینٹری اسکول کا دورہ کرنے کا موقع ملا جہاں کلاس روم کی سطح پر مصنوعی ذہانت کے ذریعے تعلیم دینے کا اولین تجربہ کیا جارہا ہے۔ دی نیو آرک اسکول ڈسٹرکٹ ''کھینمنگو'' کا تجربہ کر رہی ہے جو مصنوعی ذہانت سے تقویت پایا ہوا ٹیوٹر اور ٹیچر سپورٹ ٹُول ہے۔ میں اُسے دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔

میں نے اپنے بلاگ پر کھینمنگو کے بارے میں بہت لکھا ہے۔ اِسے گیٹس فاؤنڈیشن کے پارٹنر خان اکیڈمی نے تیار کیا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ جب بچوں کو انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ذریعے بہتر طور پر پڑھانے کی بات آئے تو خان اکیڈمی کے بانی سَل خان بصیرت سے ہم کنار شخصیت ہیں۔ اُن کی نئی کتاب ''بریو نیو ورلڈز'' کے بارے میں میرا تبصرہ بھی آپ پڑھ سکتے ہیں۔

ہم کلاس روم میں مصنوعی ذہانت کی مدد سے بچوں کو پڑھانے کے حوالے سے ابھی تک عہدِ طفولیت میں ہیں۔ نیو آرک میں جو کچھ میں نے دیکھا، اُس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ٹیکنالوجی میں بے پناہ قوت ہے اور اُس کے ذریعے دنیا کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

اساتذہ جس تخلیقی جوہر کے ساتھ مصنوعی ذہانت والے ٹولز کو استعمال کر رہے تھے، اُسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ الجبرا کی ٹیچر لیٹیز یا کولون نے بتایا کہ اُس نے آٹھویں درجے کے طلبہ کے لیے مصنوعی ذہانت کے ٹولز کی مدد سے سوالات کے ایسے سیٹ تیار کیے ہیں جو بچوں کے لیے بہت دلچسپ ثابت ہوسکتے ہیں۔ فروری میں کھینمنگو نے لیٹیز یا کو نیویارک کے باکسر شکور اسٹیونسن کے ورک آؤٹ روٹین کی تیاری میں غیر معمولی معاونت کی۔ اس صورت میں اُس کے طلبہ عملی زندگی کے ماڈل کے بارے میں جانتے ہوئے ریاضی کی مشق کرسکتے تھے۔

تیسری جماعت کی ریاضی اور سائنس کی ٹیچر چیرل ڈریکفورڈ نے بتایا کہ وہ کھینمنگو کے ذریعے بچوں کے اسائنمنٹس کے سوال تیار کرسکتی ہے۔ ٹیکنالوجی اُسے کسی بھی چیز کا اولین ڈرافٹ فراہم کرتی ہے جسے وہ اپنے طلبہ کے لیے، اُن کی ضرورت کے مطابق تیار کرتی ہے۔ مثلاً ایک بار مصنوعی ذہانت نے اُسے ایک کتاب تیار کرکے دی جو فروٹ اسٹینڈ سے متعلق کہانی پر مشتمل تھی۔ چیرل ڈریکفورڈ نے اُسے ایڈٹ کرکے پوکمون کارڈز اور روبلوکس سے مطابقت کی حامل بنادیا کیونکہ اُس کے طلبہ کو اِن دونوں سے لگاؤ ہے۔ چیرل کہتی ہے کہ کھینمنگو مجھے بنیادی خاکہ فراہم کرتا ہے اور اُس میں رنگ میں بھرتی ہوں۔

اساتذہ نے مجھے بتایا کہ وہ ہر طالب علم کے ڈیش بورڈ پر پہنچ کر جو کچھ بھی وہ پڑھ اور سیکھ رہے ہیں، اُس کا خلاصہ جان سکتے ہیں۔ اساتذہ کو اس بات کی خوشی ہے کہ وہ اپنے تمام طلبہ کی پیش رفت کا اچھی طرح، تیزی اور آسانی سے اندازہ لگاسکتے ہیں۔ اِس سے اُن کا وقت بہت بچ رہا ہے۔ وہ اس بات سے بھی خوش ہیں کہ اُن کے طلبہ کھینمنگو کو ایک پرسنلائزڈ ٹیوٹر کے طور پر عمدگی سے بروئے کار لا رہے ہیں۔

یہ ٹیکنالوجی ابھی جامعیت سے بہت دور ہے۔ جن طلبہ سے میں نے ملاقات کی، اُنہوں نے بتایا کہ کھینمنگو معاون ہے تاہم ہسپانک ناموں کے حوالے سے پیچیدگی کا سامنا ہے۔ اور یہ شکایت بھی کی کہ وائس آپشن صرف مردانہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اِسے تمام طلبہ کے لیے قابلِ قبول بنانے میں ابھی وقت لگے گا۔ آئیڈیل ٹیکنالوجی کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ مس ڈریکفورڈ کی کلاس میں موجود طلبہ کیا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں مس ڈریکفورڈ کو ایڈیٹنگ نہیں کرنا پڑے گی۔ مس کولون نے بتایا کہ اُنہیں کھینمنگو سے اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کے لیے کئی بار کوشش کرنا پڑی۔

میں نے نیو آرک میں دیکھا کہ ہم کلاس روم میں مصنوعی ذہانت کے ذریعے ابتدا کیسے کرسکتے ہیں اور یہ کہ ٹیکنالوجی ہمیں بالآخر کہاں لے جاسکتی ہے۔ بہرکیف، نیو آرک کے اِس اسکول میں میرے اس یقین کو مزید تقویت ملی کہ مصنوعی ذہانت، پختہ ہوجانے کی صورت میں، اساتذہ اور طلبہ، دونوں کے لیے گیم چینجر ثابت ہوگی۔ آج بھی فرسٹ ایونیو میں اساتذہ مصنوعی ذہانت کے ٹولز کے ذریعے معمول کی سرگرمیاں انجام دے سکتے ہیں اور یوں اُن کے پاس خوب وقت بچا رہے گا جسے وہ مزید تعمیری سرگرمیوں میں کھپا سکتے ہیں۔ وہ طلبہ کو زیادہ وقت دے سکتے ہیں، اُن میں تجسس کا گراف بلند کرسکتے ہیں اور اُنہیں اس بات کا یقین دلا سکتے ہیں کہ اُن پر توجہ دی جارہی ہے، اُن کا مشاہدہ کیا جارہا ہے۔ اور یہ بات اُن طلبہ کے لیے زیادہ اچھی رہے گی جو تھوڑی زیادہ توجہ چاہتے ہیں۔

کھینمنگو تو ابتدا ہے۔ مصنوعی ذہانت پر مشتمل بہت سے تعلیمی ٹولز ابھی پائپ لائن میں ہیں۔ گیٹس فاؤنڈیشن اس بات کو یقینی بنارہی ہے کہ یہ ٹولز تمام طلبہ تک پہنچیں، اُن کی مدد کریں۔ ہمارا بنیادی مقصد طلبہ کو کھیلنے کے لیے ہموار میدان فراہم کرنا ہے نہ کہ موجودہ خلا کو مزید وسیع کرنا۔ ہم اس وقت ملک بھر میں ایجوکیٹرز کے ساتھ کام کررہے ہیں تاکہ اُن سے فیڈ بیک لے کر ٹیکنالوجی کو اُن کی ضرورتوں کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ معقول بناسکیں۔ نیو آرک کے اسکول کا دورہ بھی اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ وہاں طلبہ اور اساتذہ، دونوں کا جوش اور جذبہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

میں نیو آرک میں جن ایجوکیٹرز سے ملا، وہ واقعی اپنے شعبے میں پہل کرنے والوں میں سے ہیں۔ چند ایک کی مہارت غیر معمولی تھی۔ وہ کلاس روم میں مصنوعی ٹیکنالوجی کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ چند اساتذہ مصنوعی ذہانت سے کام کرنے والے ٹولز کو بہت احتیاط سے اور کم کم بروئے کار لا رہے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ اسکول کی انتظامیہ ہر ٹیچر کو اُس کی ضرورت کے مطابق انفارمیشن ٹیکنالوجی سے ہم کنار کر رہی

////// باقی صفحہ نمبر ۹ \\\\\\

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950